مشمولات

❁ عرضِ احوال	ہم کہاں کھڑے ہیں؟	حافظ عاکف سعید	3
❁ بیان القرآن	سورۃ النساء (آیات ۳۶۔۷۰)	ڈاکٹر اسرار احمد	9
❁ تازہ خواہی داشتن	تذکرہ وتبصرہ میثاق جولائی ۱۹۶۶ء	مولانا امین احسن اصلاحی ڈاکٹر اسرار احمد	78
	میثاق کا اجرا کیوں؟	مولانا امین احسن اصلاحی	81
	یہ نصف صدی کا قصہ ہے! (انٹرویو)	ڈاکٹر اسرار احمد	89
	حقیقتِ میثاق	انجینئر نوید احمد	94
❁ تبریک و تھنیت	ماہنامہ میثاق میری نظر میں	معاصر اہل قلم حضرات	100
❁ اعتصامش کُن	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	ڈاکٹر اسرار احمد	109
	بیان القرآن —— ایک تعارف	پروفیسر عبدالجبار شاکر	115
	قرآن مجید سے بعدُ اور بیگانگی کے اسباب	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	123
❁ حق گوئی و بیباکی	جہاد کی اعلیٰ قسم	مولانا عبدالغفار حسن	137
❁ تعمیرِ سیرت	’’لہوالحدیث‘‘ کا مفہوم	عتیق الرحمٰن صدیقی	160
❁ در دِل مُسلم	حرمتِ ناموسِ رسالت	انجینئر نوید احمد	171
❁ نجومِ ھدایت	اصحابِ رسولؐ کی استقامت	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	183
❁ تعلیم و تعلّم	اسلامی مدارس میں عربی کی تعلیم	محمد بشیر	191
❁ اسلامی معاشرت	اسلام میں طلاق کا قانون اور فلسفہ	سید شہاب الدین ندوی	201
❁ افکار و آراء	سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام	پروفیسر عبدالعظیم جانباز	215

اطلاع برائے قارئین

قارئین نوٹ فرمالیں کہ میثاق کی پیش نظر خصوصی اشاعت تین ماہ (اکتوبر۔نومبر۔دسمبر ۲۰۰۹ء) پر مشتمل ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

ماہنامہ ''میثاق'' کا اجراء ۱۹۵۹ء میں معروف عالمِ دین اور صاحبِ 'تدبر قرآن' مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم ومغفور نے کیا تھا۔ اس اعتبار سے سال ۲۰۰۹ء میں اس کے اجراء کو پچاس سال مکمل ہو گئے ہیں۔ ''میثاق'' کا زیرنظر شمارہ اسی حوالے سے ایک خاص اشاعت کا درجہ رکھتا ہے۔ میثاق کے پہلے شمارے میں مولانا مرحوم ومغفور نے پرچے کی وجہ تسمیہ کی وضاحت کرتے ہوئے دینی اعتبار سے لفظ میثاق کی معنویت کو نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے اُجاگر کیا تھا۔ یہ مضمون اپنی جگہ علم وادب کا ایک خوبصورت شہ پارہ تو ہے ہی' اس پرچے کے اعتبار سے تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ زیرنظر شمارے میں دیگر بہت سے خصوصی مضامین کے ساتھ ساتھ جو قندِ مکرر کے طور پر شائع کیے جا رہے ہیں' اس مضمون کو بھی ہدیہ قارئین کیا گیا ہے —— مولانا اصلاحی مرحوم ومغفور کے زیرادارت ایک بلند پایہ دینی علمی جریدے کے طور پر اس پرچے کی اشاعت جولائی ۱۹۶۵ء تک جاری رہی۔ لیکن پھر وسائل کی کمی آڑے آئی اور کچھ عرصہ اس کی اشاعت تعطل کا شکار رہی —— بعدازاں جولائی ۱۹۶۶ء سے اس پرچے کی اشاعت کا بیڑا مولانا اصلاحی مرحوم کے ایماء پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ نے اٹھایا جو انہی دنوں خدمتِ دینی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنے آبائی شہر ساہیوال سے لاہور منتقل ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں جب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ نے غلبہ واقامت دین کے فریضے کی ادائیگی کی خاطر تنظیم اسلامی کے نام سے جماعتی وتحریکی جدوجہد کا آغاز کیا تو میثاق اس تحریک کا آرگن قرار پایا—— وہ دن اور آج کا دن' بفضل اللہ تعالیٰ وبعونہ میثاق اسی حیثیت میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے اور بحمد اللہ پاکستان اور انڈیا کے دینی وعلمی حلقوں میں ایک معیاری دینی تحریکی جریدے کے طور پر اپنی شناخت رکھتا ہے۔

گزشتہ پچاس برس کی ملکی وملی تاریخ پر جب ہم ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو بدقسمتی سے کچھ اچھی حوصلہ افزا صورت سامنے نہیں آتی —— یہ درست ہے کہ انیسویں صدی کے وسط

سے اس اُمت پر وہ بدترین دور بھی آیا تھا کہ پورا عالمِ اسلام یورپی اقوام کے زیرِنگیں تھا‘ بالخصوص بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد تقریباً تمام مسلمان ممالک اقوامِ یورپ کے براہِ راست غلام اور محکوم بن چکے تھے‘اور مولانا حالی کے یہ اشعار اُمت کی زبوں حالی کی بہترین ترجمانی کرتے نظر آئے تھے کہ: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

بلاشبہ یہ وہ دور تھا کہ مسلم اُمہ سیاسی تاریخ کے اعتبار سے اپنے زوال وانحطاط کے پست ترین مقام پر کھڑی تھی —— تاہم سیاسی غلامی ومحکومی کا یہ دور عارضی ثابت ہوا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ چنانچہ پچھلی صدی کے وسط کے آس پاس مسلمان ممالک ایک ایک کر کے آزاد ہوتے چلے گئے اور برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی آزادی کا سورج ’’پاکستان‘‘ کی شکل میں طلوع ہوا‘ جو ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء بمطابق ۲۷/رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو دنیا کے نقشے کی زینت بنا۔

قیامِ پاکستان کی صورت میں مسلمانانِ ہند کی آزادی کی تحریک کی کامیابی میں جہاں معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی بے لوث اور جرأت مندانہ قیادت کو بڑا دخل حاصل تھا وہاں مسلمانانِ ہند کے سینوں میں جذبہ آزادی اور احیاءِ اسلام کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا عزم بیدار کرنے میں بہت بڑا حصہ علامہ اقبال کی ولولہ انگیز شاعری کا بھی تھا‘ جس نے ایک اُمید افزا پیغام کی صورت میں ہند کے مسلم نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کی جوت جگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ علامہ اقبال کے یہ امید افزا اشعار ایک مجسم حقیقت بن کر سامنے آ گئے کہ ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اسی طرح ان کی نگاہِ دوربین‘ آنے والی اس حقیقت کا بالکل صحیح مشاہدہ کر رہی تھی کہ ع ؎

من بسیمائے غلاماں فرسلطاں دیدہ اَم!

بہرکیف قیامِ پاکستان کی صورت میں مسلمانانِ ہند کی سیاسی آزادی کا جو خواب علامہ

اقبال نے دیکھا تھا وہ تو بہت حد تک پورا ہو گیا‘ لیکن اس کے ساتھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور اسلام کے عالمی احیاء کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ علامہ کے درج ذیل اشعار پر ذرا نگاہ ڈالیے‘ اور دیکھئے کہ وہ اس حوالے سے کتنے پُر امید تھے!

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے! یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا‘ امانت کا‘ شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

تاہم مسلمان ممالک کی یورپی اقوام کی غلامی سے نجات بھی جزوی اور عارضی ثابت ہوئی۔ ہم فرنگ کی سیاسی غلامی کے چنگل سے تو نکل آئے لیکن ذہنی وفکری غلامی اور علمی وثقافتی غلامی کے چنگل سے نہ نکل سکے۔ گویا ؎

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے!

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزادی کی نعمت ملنے کے بعد پاکستان سمیت تمام مسلمان ممالک نہ صرف یہ کہ اپنے اپنے علاقے میں اللہ کے دین کو قائم و غالب اور اس کی شریعت کو نافذ کرتے بلکہ مل جل کر خلافتِ اسلامیہ کے اس عظیم ادارے کے احیاء کی سعی کرتے جو مسلم اُمت کی وحدت کا نشان اور قوت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ آزادی کی نعمت ملتے ہی ہم اللہ کے احسانِ عظیم اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو بھول کر دنیاداری‘ نفس پرستی اور ہوس زر کا شکار ہو کر عام انسانی اخلاق سے بھی محروم ہو گئے۔ چنانچہ ہماری اس ناشکر گزاری اور دین سے بے وفائی کا صلہ ہمیں یہ ملا کہ یہ سیاسی آزادی وخودمختاری بھی عارضی ثابت ہوئی اور بہت جلد مسلمان ممالک کی عظیم اکثریت کی صورت یہ ہو گئی کہ ان کی سیاسی حکومتیں جو ظاہراً آزاد نظر آتی تھیں‘ درونِ خانہ پورے طور پر اس فرنگ کی غلام اور محکوم بن کر رہ گئیں جس کا سرخیل پہلے برطانیہ تھا اور اب امریکہ ہے۔

واضح رہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں عالمِ اسلام پر مغربی اقوام کی یورش اور بزورِ

قوت ان پر سیاسی وعسکری تسلط حق و باطل کے ازلی معرکے کے ظہور سے زیادہ ’’ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات‘‘ کے آفاقی اصول کا مظہر تھا۔ چنانچہ اقوامِ مغرب کے اس سیاسی وعسکری تسلط کا شکار صرف عالمِ اسلام نہیں تھا بلکہ براعظم افریقہ‘ ایشیا اور مشرق بعید کے وہ غیر مسلم ممالک بھی یکساں طور پر ان کی جارحیت کا نشانہ بنے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے باعث جدید مادّی وعسکری قوت سے محروم تھے —— تاہم‘ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی۔ یورپی استعمار کی بساط سمٹنے لگی‘ برطانیہ کی جگہ امریکہ ایک عظیم قوت کے روپ میں سامنے آیا اور نظریاتی سطح پر سوویت یونین زبردست فوجی قوت کے ساتھ‘ اس کے ایک مضبوط حریف کے طور پر سامنے آیا۔ یوں دنیا میں وقتی طور پر طاقت کا ایک توازن قائم ہوا اور مسلمان ممالک یورپی اقوام کی براہِ راست غلامی سے آزاد ہوتے چلے گئے۔ بقول اقبال ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا‘ وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مُقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

بیسویں صدی کے وسط میں اگرچہ بے شمار مسلمان ممالک کو یورپی استعمار کے براہِ راست تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی‘ لیکن ان میں پاکستان کا معاملہ مختلف بلکہ منفرد اور ممتاز تھا کہ یہ واحد مسلمان ملک تھا جہاں آزادی کی تحریک اسلام کے نام پر چلائی گئی‘ جو بفضلہٖ تعالیٰ کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور یوں مسلمانانِ پاکستان کے لیے اقبال کا یہ شعر ایک مجسم حقیقت ثابت ہوا ؎

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے‘ تو مصطفوی ہے!

قیامِ پاکستان کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر آبادی کے لحاظ سے وقت کی سب سے بڑی مسلمان مملکت منصۂ شہود پر آئی۔ دوسری طرف اسلام کے ازلی دشمن یہود جو گزشتہ اٹھارہ صدیوں سے دربدر کی خاک چھان رہے تھے اور ۷۰ء کے بعد سے مسلسل جلاوطنی اور ذلت و رسوائی کے خدائی عذاب میں گرفتار تھے‘ بالآخر انہیں بیسویں صدی کے وسط میں ریاست اسرائیل کے قیام کی صورت میں فلسطین میں دوبارہ قدم جمانے کا موقع ملا تھا‘ اور اب پوری دنیا پر حکومت کرنے اور نوعِ انسانی کو اپنی معاشی غلامی کے جال میں جکڑنے کا جو خواب

Protocols of the Zions کی صورت میں انہوں نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں دیکھا تھا‘ اس کی عملی تعبیر کے امکانات ع ’’پیدا کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں‘‘ کے انداز میں انہیں نظر آنے لگے تھے۔ یہودی دانشور اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان کے ناپاک عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اگر کوئی بن سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ چنانچہ اسلام کے نام پر بننے والا یہ عظیم ملک پاکستان اوّل روز سے ان کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ انہوں نے عالمی طاقت امریکہ کے ذریعے‘ جس کی رگِ جاں پہلے ہی ان کے شکنجے میں تھی‘ پاکستان کے خلاف پہلے دن سے سازشی کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کی تفصیل سے غضِ بصر اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ بہرکیف ’’سادگی اپنوں کی دیکھ‘ اوروں کی عیاری بھی دیکھ!‘‘ کے مصداق اصل جرم ہمارا اپنا ہے کہ ہم نے دین سے بے وفائی کا معاملہ کیا تو اللہ نے بھی اپنی نصرت وحفاظت سے ہمیں محروم کر دیا اور ہم دشمنوں کی سازشوں کا شکار کچھ اس طور سے ہوتے چلے گئے ع کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

قیامِ پاکستان کے معاً بعد قائداعظم کی رحلت ایک سانحے سے کم نہ تھی۔ بعد میں آنے والی مسلم لیگی قیادت کا بڑا حصہ سیکولر سوچ کا حامل تھا۔ یہ لوگ قائداعظم کے بیسیوں ’’محکم‘‘ بیانات کو نظر انداز کر کے جن میں قائداعظم نے پاکستان کو ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کا واضح عندیہ دیا تھا‘ ان کے ایک ’’متشابہہ‘‘ بیان کو جس سے سیکولرازم کی تائید کا اشارہ ملتا تھا‘ فیصلہ کن قرار دے کر پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے پرُتلے ہوئے تھے۔ ان سیکولر طبقات کی شدید مخالفت کے باوجود دینی طبقات کی جدوجہد کے نتیجے میں ’’قراردادِ مقاصد‘‘ کا منظور ہوجانا معجزے سے کم نہ تھا‘ جس میں دوٹوک انداز میں اللہ تعالیٰ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن اسے دستور کا حصہ بنانے کی بجائے محض دیباچے (preamble) کے طور پر شامل کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ وہ عملاً غیر موثر ہی رہی۔ قصہ مختصر‘ پاکستان کے قیام کے بعد ابتدائی چند سال اسی بحث کی نذر ہو گئے کہ ’’آئینِ گلستاں کیا ہوگا‘ دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟‘‘ امریکہ کی درپردہ مداخلت تو اوّل روز ہی سے کسی نہ کسی درجے میں موجود تھی‘ قیامِ پاکستان کے گیارہ برس بعد غیروں کی سازشوں کا سب سے نمایاں مظہر‘ ایوب خان کے مارشل لاء کی صورت میں سامنے آ گیا۔ آئین کی دھجیاں بکھیر کر فوجی قوت کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد کی

تکمیل امریکی سازشی ذہنیت کا شاخسانہ تھی جس کی پشت پر یہودی ذہن کارفرما تھا۔ یہود و نصاریٰ دراصل اس بات سے خائف تھے کہ پاکستان کہیں حقیقی معنوں میں اسلام کا وہ مضبوط قلعہ نہ بن جائے جس کا خواب علامہ اقبال اور قائداعظم نے دیکھا تھا۔ چنانچہ پاکستان کے اسلامی تشخص کو مٹانا اور اسے معاشی اور عسکری اعتبار سے اپنا دست نگر رکھنا‘ یہاں تک کہ ملکی سیاسی معاملات میں بھی درپردہ مداخلت کے ذریعے اپنے تابع رکھنا اور حسب ضرورت مارشل لاء کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرنا اوّل روز سے یہود و نصاریٰ کے پیش نظر رہا۔ ادھر اپنوں کی سادگی کا یہ عالم رہا کہ امریکہ کی بار بار کی بے وفائیوں اور دغابازیوں کے باوجود ہماری سیاسی و عسکری قیادت اسی کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتی رہی اور ع ’’میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب‘‘ کے مصداق اسی امریکی سامراج کو ہم اپنے درد کا درماں سمجھتے رہے جو ہماری خودمختاری و خودداری کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ہمیں ایٹمی صلاحیت سے محروم کر کے دائمی طور پر اپنے در کے ایک مفلوج بھکاری کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے —— ہم نے بحیثیتِ قوم اللہ کے در پر جھکنے کی بجائے واشنگٹن کو اپنا قبلہ بنائے رکھنے کی پالیسی اختیار کی اور اس مملکتِ خداداد میں جو اللہ نے ہمیں معجزہ کے طور پر عطا فرمائی تھی‘ اُس کے دین کو قائم و غالب کرنے اور یہاں شریعتِ الٰہی کا نفاذ کرنے کی بجائے انگریز کے چھوڑے ہوئے باطل نظام کو سینے سے لگائے رکھا ؎

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

دین سے ہماری بے وفائی اور یہود و نصاریٰ کی ’’عنایات‘‘ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ پاکستان کے چوبیس برس بعد ہمیں بھارت کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ملک دولخت ہو گیا۔ یہ ہم پر عذابِ الٰہی کا پہلا قابل ذکر کوڑا تھا —— بدقسمتی سے ہم نے اس عبرت انگیز واقعے سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ ہماری قومی زندگی کا پرنالہ وہیں گرتا رہا۔ ہمارے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ نہ تو قومی سطح پر ہم نے اپنا قبلہ درست کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی افرادِ قوم کی زندگی کے اس نقشے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی جس کا مرثیہ اقبال نے ’’جوابِ شکوہ‘‘ میں کہا تھا ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

(باقی صفحہ ۲۲۱ پر)

سُورۃُ النِّساء

آیات ۳۶ تا ۴۳

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝۳۶ ۨ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ
بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا
مُّهِيْنًا ۝۳۷ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا
بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝۳۸ وَمَاذَا
عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ
اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً
يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۴۰ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ
اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝۴۱ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ
حَدِيْثًا ۝۴۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ
كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ
النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ

﴿وَاَيۡدِيۡكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۴۳﴾﴾

اس سے قبل سورۃ البقرۃ آیت ۸۳ میں بنی اسرائیل سے لیے جانے والے میثاق کا ذکر آیا تھا۔ اس میثاق میں جو باتیں مذکور تھیں وہ گویا اُمہاتِ شریعت یا دین کی بنیادیں ہیں۔ ارشاد ہوا: ''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اللہ کے' اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو گے اور قرابت داروں' یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھی' اور لوگوں سے اچھی بات کہو' اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو''۔ اب یہ دوسرا مقام آ رہا ہے کہ شریعت کے اندر جو چیزیں اہم تر ہیں اور جنہیں معاشرتی سطح پر مقدم رکھنا چاہیے وہ بیان کی جا رہی ہیں۔ فرمایا:

آیت ۳۶ ﴿وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا﴾ ''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ''

سب سے پہلا حق اللہ کا ہے کہ اُسی کی بندگی اور پرستش کرو' اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

﴿وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا﴾ ''اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو''

قرآن حکیم میں ایسے چار مقامات ہیں جہاں اللہ کے حق کے فوراً بعد والدین کے حق کا تذکرہ ہے۔ یہ بھی ہمارے خاندانی نظام کے لیے بہت اہم بنیاد ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہو' ان کا ادب و احترام ہو' ان کی خدمت کی جائے' ان کے سامنے آواز پست رکھی جائے۔ یہ بات سورۂ بنی اسرائیل میں بڑی تفصیل سے آئے گی۔ ہمارے معاشرے میں خاندان کے استحکام کی یہ ایک بہت اہم بنیاد ہے۔

﴿وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ﴾ ''اور قرابت داروں' یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ''

﴿وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ﴾ ''اور قرابت دار ہمسائے اور اجنبی ہمسائے کے ساتھ''

پہلے عام طور پر محلے ایسے ہی ہوتے تھے کہ ایک قبیلہ ایک ہی جگہ رہ رہا ہے' رشتہ داری بھی ہے اور ہمسائیگی بھی۔ لیکن کوئی اجنبی ہمسایہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے آج کل شہروں میں ہمسائے

اجنبی ہوتے ہیں۔

﴿وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡبِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ﴾ ’’اور ہم نشین ساتھی اور مسافر کے ساتھ‘‘

ایک ہمسائیگی عارضی نوعیت کی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آپ بس میں بیٹھے ہوئے ہیں‘ آپ کے برابر بیٹھا ہوا شخص آپ کا ہمسایہ ہے۔ نیز جو لوگ کسی بھی اعتبار سے آپ کے ساتھی ہیں‘ آپ کے پاس بیٹھنے والے ہیں‘ وہ سب آپ کے حسن سلوک کے مستحق ہیں۔

﴿وَمَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ﴾ ’’اور وہ لونڈی غلام جو تمہارے ملک یمین ہیں (ان کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو)۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۣ﴿۳۶﴾﴾ ’’اللہ بالکل پسند نہیں کرتا اُن لوگوں کو جو شیخی خورے اور اکڑنے والے ہوں۔‘‘

آیت ۳۷ ﴿الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ﴾ ’’جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں‘‘

جن میں یہ شیخی خوری اور اکڑ ہوتی ہے پھر وہ بخیل بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ غرور و تکبر عام طور پر دولت کی بنا پر ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمارے پاس جو دولت ہے اگر یہ خرچ ہو گئی تو ہمارا وہ مقام نہیں رہے گا‘ لوگوں کی نظروں میں ہماری عزت نہیں رہے گی۔ لہٰذا وہ اپنا مال خرچ کرنے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ اس پر انہیں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ ہمیں ملامت کریں گے کہ تم بڑے بخیل ہو‘ چنانچہ وہ خود لوگوں کو اس طرح کے مشورے دینے لگتے ہیں کہ بابا اس طرح کھلا خرچ نہ کیا کرو‘ تم خواہ مخواہ پیسے اڑاتے ہو‘ عقل کے ناخن لو‘ کچھ نہ کچھ بچا کے رکھا کرو‘ وقت پر کام آئے گا۔ اس طرح وہ لوگوں کو بھی بخل ہی کا مشورہ دیتے ہیں۔

﴿وَیَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ﴾ ’’اور وہ چھپاتے ہیں اس کو جو اللہ نے انہیں اپنے فضل میں سے دیا ہے۔‘‘

اپنی دولت کو چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ دولت ظاہر ہو گی تو کوئی سائل سوال کر بیٹھے گا۔ لہٰذا خود ہی مسکین صورت بنائے رکھتے ہیں کہ کوئی ان کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔

﴿وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ﴿ۚ۳۷﴾﴾ ’’اور ایسے ناشکروں کے لیے ہم نے بڑا

اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿وَالَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَـھُمۡ رِئَـآءَ النَّاسِ﴾ ''اور وہ لوگ (بھی اللہ کو ناپسند ہیں) جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لیے''

﴿وَلاَ یُـؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلاَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ ''اور وہ حقیقت میں ایمان نہیں رکھتے نہ اللہ پر نہ یومِ آخر پر۔''

﴿وَمَنۡ یَّـکُنِ الشَّیۡطٰنُ لَـہٗ قَرِیۡنًا فَسَآءَ قَرِیۡنًا ﴿۳۸﴾﴾ ''(ایسے لوگ گویا شیطان کے ساتھی ہیں) اور جس کا ساتھی شیطان ہو جائے تو وہ بہت ہی برا ساتھی ہے۔''

آیت ۳۹ ﴿وَمَاذَا عَلَیۡھِمۡ لَـوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ﴾ ''ان لوگوں پر کیا آفت آ جاتی اگر یہ اللہ اور یومِ آخر پر (صدقِ دل سے) ایمان لے آتے''

﴿وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقَھُمُ اللّٰہُ﴾ ''اور خرچ کرتے (کھلے دل کے ساتھ) اس میں سے جو اللہ نے انہیں دیا ہے۔''

﴿وَکَانَ اللّٰہُ بِھِمۡ عَلِیۡمًا ﴿۳۹﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح واقف ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ﴾ ''یقیناً اللہ کسی پر ذرّے کے ہم وزن بھی ظلم نہیں کرے گا۔''

﴿وَاِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡھَا﴾ ''اگر ایک نیکی ہو گی تو اس کو کئی گنا بڑھائے گا''

﴿وَیُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡہُ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۴۰﴾﴾ ''اور خاص اپنے خزانہ فضل سے مزید بہت بڑا اجر دے گا۔''

اس سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت بڑی اہم ہے۔ یہ اُس شہادت علی الناس سے متعلق ہے جو مضمون سورۃ البقرۃ (آیت ۱۴۳) میں آیا تھا کہ اے مسلمانو! تمہیں اب شہداء علی الناس بنایا گیا ہے' جیسے کہ نبیؐ نے تم پر شہادت دی ہے۔ نبی مکرمﷺ قیامت کے دن کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ میرے پاس جو دین آیا تھا میں نے انہیں پہنچا دیا تھا' اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہی بات قیامت کے دن کھڑے ہو کر تمہیں کہنی ہے کہ اے اللہ ہم نے اپنے زمانے کے لوگوں تک تیرا دین پہنچا دیا تھا' اب اس کے بعد اپنے طرزِ عمل کے یہ خود جواب دہ

ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ الٹا وہ ہمارے اوپر مقدمہ کریں کہ اے اللہ ان بدبختوں نے ہمیں تیرا دین نہیں پہنچایا' یہ خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہے۔ یہ تو شہادت کا ایک رخ ہے' لیکن جس کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہو' واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے تو یہ ایک بہت بھاری بوجھ ہے۔ یہاں اس کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن کیا ہوگا۔

آیت ۴۱ ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ﴾ ''تو اُس دن کیا صورت حال ہوگی جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے'' ۔

یعنی اُس نبی اور رسول کو گواہ بنا کر کھڑا کریں گے جس نے اس اُمت کو دعوت پہنچائی ہوگی۔

﴿وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓـؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴿۴۱﴾﴾ ''اور (اے نبی) آپ کو لائیں گے ہم ان پر گواہ بنا کر۔''

یعنی آپؐ کو کھڑے ہو کر کہنا ہوگا کہ اے اللہ! میں نے ان تک تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ ہماری عدالتی اصطلاح میں اسے استغاثہ کا گواہ (prosecution witness) کہا جاتا ہے۔ گویا عدالتِ خداوندی میں نبی مکرمﷺ استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ' تیرا پیغام جو مجھ تک پہنچا تھا میں نے انہیں پہنچا دیا تھا' اب یہ خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ چنانچہ اپنی ہی قوم کے خلاف گواہی آ گئی نا؟ یہاں الفاظ نوٹ کر لیجیے: عَلٰى هٰٓـؤُلَآءِ شَهِيْدًا اور عَلٰى ہمیشہ مخالفت کے لیے آتا ہے۔ ہم تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے شفاعت کی امید میں ہیں اور یہاں ہمارے خلاف مقدمہ قائم ہونے چلا ہے۔ اللہ کے رسولﷺ دربارِ خداوندی میں ہمارے خلاف گواہی دیں گے کہ اے اللہ! میں نے تیرا دین ان کے سپرد کیا تھا' اب اسے دنیا میں پھیلانا ان کا کام تھا' لیکن انہوں نے خود دین کو چھوڑ دیا۔ سورۃ الفرقان میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴿۳۰﴾﴾ ''اور رسولؐ کہیں گے کہ پروردگار' میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا''۔ سورۃ النساء کی آیت زیر مطالعہ کے بارے میں ایک واقعہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ! انہوں نے عرض کیا حضور آپ کو سناؤں؟ آپؐ پر تو نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ہاں' لیکن مجھے کسی دوسرے سے سن کر کچھ اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہؓ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ حضورؐ بھی سن رہے تھے' باقی اور صحابہؓ بھی ہوں گے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ گردن جھکائے پڑھتے جا رہے تھے۔ جب

اس آیت پر پہنچے ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓـؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴿۴۱﴾﴾ تو حضورﷺ نے فرمایا: حَسْبُكَ، حَسْبُكَ(بس کرو، بس کرو!) عبداللہ بن مسعودؓ نے سر اٹھا کر دیکھا تو حضورﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس وجہ سے کہ مجھے اپنی قوم کے خلاف گواہی دینی ہوگی۔

آیت ۴۲ ﴿يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ﴾ ''اُس دن تمنا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور رسول کی نافرمانی کی تھی کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔''

یعنی کسی طرح زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں دفن ہو جائیں، ہمیں نسیاً منسیّا کر دیا جائے۔

﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴿۴۲﴾﴾ ''اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے۔''

آیت ۴۳ ﴿يٰٓـاَيُّـهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْـتُمْ سُكٰرٰى﴾ ''اے اہل ایمان، نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو''

﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ ''یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جو کچھ تم کہہ رہے ہو''

سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۹) میں شراب اور جوئے کے بارے میں محض اظہارِ ناراضگی فرمایا گیا تھا کہ ﴿اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّـفْعِهِمَا ؕ﴾ ''ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے''۔ اب اگلے قدم کے طور پر شراب کے اندر جو خباثت، شناعت اور برائی کا پہلو ہے اسے ایک مرتبہ اور اجاگر کیا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو۔ جب تک نشہ اُتر نہ جائے اور تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اُس وقت تک نماز نہ پڑھا کرو۔ چونکہ شراب کی حرمت کا حکم ابھی نہیں آیا تھا لہٰذا بعض اوقات لوگ نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے۔ ایسے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں کہ کسی نے نشے میں نماز پڑھائی اور ''لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' کے بجائے ''اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' پڑھ دیا۔ اس پر خاص طور پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ کے الفاظ قابل غور ہیں کہ جب تک کہ تم شعور کے ساتھ سمجھ نہ رہے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو! اس میں ایک اشارہ ادھر بھی ہو گیا کہ بے سمجھے نماز مت پڑھا کرو! یعنی ایک تو مدہوشی کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا اور غلط سلط پڑھ رہے ہیں تو اس سے روکا جا رہا ہے، اور ایک سمجھتے ہی نہیں کہ نماز میں کیا پڑھ رہے ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔ اب جنہیں قرآن مجید کے معنی نہیں آتے،

نماز کے معنی نہیں آتے‘ انہیں کیا پتا کہ وہ نماز میں کیا کہہ رہے ہیں!

﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ؕ﴾ ’’اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے قریب نہ جاؤ) جب تک غسل نہ کر لو‘ اِلّا یہ کہ راستے سے گزرتے ہوئے۔‘‘

اگر تم نے اپنی بیویوں سے مباشرت کی ہو یا احتلام وغیرہ کی شکل ہوگئی ہو تب بھی تم نماز کے قریب مت جاؤ جب تک کہ غسل نہ کر لو۔ ’’اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ‘‘ کے بارے میں بہت سے قول ہیں۔ بعض فقہاء اور مفسرین نے اس کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ حالتِ جنابت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے‘ اِلا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو‘ جبکہ بعض نے اس سے مراد سفر لیا ہے۔

﴿وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ﴾ ’’اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو‘‘

آدمی کو تیز بخار ہے یا کوئی اور تکلیف ہے جس میں غسل کرنا مضر ثابت ہوسکتا ہے تو تیمّم کی اجازت ہے۔ اسی طرح کوئی شخص سفر میں ہے اور اسے پانی دستیاب نہیں ہے تو وہ تیمّم کر لے۔

﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾ ’’یا تم میں سے کوئی قضاءِ حاجت کے بعد آیا ہو‘‘

﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ ’’یا تم نے عورتوں کے ساتھ مباشرت کی ہو‘‘

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ ’’پھر تم پانی نہ پاؤ‘‘

﴿فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا﴾ ’’تو پاک مٹی کا قصد کرو‘‘

یعنی وہ تمام صورتیں جن میں غسل یا وضو واجب ہے‘ ان میں اگر بیماری غسل سے مانع ہو‘ حالت سفر میں نہانا ممکن نہ ہو‘ قضائے حاجت یا عورتوں سے مباشرت کے بعد پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمّم کر لیا جائے۔

﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ ؕ﴾ ’’اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا‘ بخشنے والا ہے۔‘‘

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے لیلۃ القدر کی جو دعا مروی ہے اس میں یہی لفظ آیا ہے: ((اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ)) ’’اے اللہ‘ تو معاف فرمانے والا ہے‘ معافی کو پسند کرتا

ہے‘ پس تو مجھے معاف فرما دے!‘‘

سورۃ النساء کی ان تینتالیس آیات میں وہی سورۃ البقرۃ کا انداز ہے کہ شریعت کے احکام مختلف گوشوں میں‘ مختلف پہلوؤں سے بیان ہوئے۔ عبادات کے ضمن میں تیمّم کا ذکر آ گیا‘ وراثت کا قانون پوری تفصیل سے بیان ہو گیا اور معاشرے میں جنسی بے راہ روی کی روک تھام کے لیے احکام آ گئے‘ تاکہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں آئے جہاں ایک مستحکم خاندانی نظام ہو۔ اب یہاں ایک مختصر سا خطاب اہل کتاب کے بارے میں آ رہا ہے۔

آیات ۴۴ تا ۵۷

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَۃَ
وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ
وَلِیًّا ٝ وَّکَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیۡرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ
مَّوَاضِعِہٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَیۡنَا وَاسۡمَعۡ غَیۡرَ مُسۡمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّۢا
بِاَلۡسِنَتِہِمۡ وَطَعۡنًا فِی الدِّیۡنِ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ قَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاسۡمَعۡ
وَانۡظُرۡنَا لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَاَقۡوَمَ ۙ وَلٰکِنۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَلَا
یُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۴۶﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اٰمِنُوۡا بِمَا نَزَّلۡنَا
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّطۡمِسَ وُجُوۡہًا فَنَرُدَّہَا عَلٰۤی اَدۡبَارِہَاۤ
اَوۡ نَلۡعَنَہُمۡ کَمَا لَعَنَّاۤ اَصۡحٰبَ السَّبۡتِ ؕ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ
اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَمَنۡ
یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ
اَنۡفُسَہُمۡ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ
یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ وَکَفٰی بِہٖۤ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۵۰﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ
اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ وَیَقُوۡلُوۡنَ
لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ہٰۤؤُلَآءِ اَہۡدٰی مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِیۡلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ
لَعَنَہُمُ اللّٰہُ ؕ وَمَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ نَصِیۡرًا ﴿۵۲﴾ اَمۡ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّنَ

الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى
مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ
وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ
كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ
فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

آیت ۴۴ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ ”کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنہیں کتاب میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا“

وہ ”الکتاب“ ایک حقیقت ہے جس میں سے ایک حصہ تورات اور ایک حصہ انجیل کے نام سے نازل ہوا اور پھر وہ کتاب ہر اعتبار سے کامل ہو کر قرآن کی شکل میں نازل ہوئی۔

﴿يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾﴾ ”وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔“

مشرکینِ مکہ بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے کہ لوگ لہو ولعب میں مشغول رہیں اور قرآن نہ سنیں۔ انہوں نے ایران سے رستم و اسفندیار کے قصے منگوا کر داستان گوئی کا سلسلہ شروع کیا اور گانے بجانے والی لونڈیوں اور آلاتِ موسیقی کا انتظام کیا تاکہ لوگ انہی چیزوں میں مشغول رہیں اور حضورﷺ کی بات کوئی نہ سنے۔ اسی طرح مدینہ میں یہود کا بھی یہی معاملہ تھا کہ وہ خود بھی گمراہ کن مشاغل اختیار کرتے اور دوسروں کو بھی اس میں مشغول کرنے کی کوشش کرتے۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے مشاغل کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ہمارے ہاں جب کرکٹ میچ ہو رہے ہوتے ہیں اور ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں تو پوری قوم کا یہ حال ہوتا ہے گویا دنیا کی اہم ترین شے کرکٹ ہی ہے۔ اسی طرح دنیا میں دوسرے کھیل تماشے دیکھے جاتے ہیں کہ دنیا ان کے پیچھے پاگل ہو جاتی ہے۔ شیطان کو اور کیا چاہیے؟ وہ تو یہی چاہتا ہے نا کہ لوگوں کی حقائق کی طرف نگاہ ہی نہ ہو۔ کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو کہ زندگی کس لیے ہے؟ جینا

کا ہے کے لیے ہے؟ موت ہے تو اس کے بعد کیا ہونا ہے؟ انسان یا تو حیوانی سطح پر زندگی گزار دے کہ اسے حلال وحرام کی تمیز ہی نہ رہے کہ وہ کیا کما رہا ہے اور کیا کھا رہا ہے' اور یا پھر اس طرح کے لہو ولعب کے اندر زندگی گزار دے۔ ان چیزوں کے فروغ کے لیے بڑے بڑے مستحکم نظام ہیں اور ان کھلاڑیوں وغیرہ کے لیے بہت بڑے بڑے انعامات ہوتے ہیں۔ فرمایا: یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی سیدھے راستے سے بھٹکا دیں' راہِ حق سے منحرف کر دیں۔

آیت ۴۵ ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ﴾ ''اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے۔''

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾﴾ ''اور اللہ کافی ہے تمہارے ولی اور پشت پناہ ہونے کی حیثیت سے اور وہ کافی ہے تمہارے مددگار ہونے کے اعتبار سے۔''

آیت ۴۶ ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ ''ان یہودیوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو کلام کو اس کے اصل مقام ومحل سے پھیرتے ہیں''

﴿وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ''وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے نہیں مانا''

یہود اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر الفاظ کو کچھ کا کچھ بنا دیتے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو احکامِ الٰہی سن کر کہتے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا۔ بظاہر وہ اہل ایمان کی طرح سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور ہم نے قبول کیا) کہہ رہے ہوتے لیکن زبان کو مروڑ کر حقیقت میں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہتے۔

﴿وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ ''اور (کہتے ہیں) سنیے' نہ سنا جائے۔''

وہ حضور ﷺ کی مجلس میں آپؐ کو مخاطب کر کے کہتے ذرا ہماری بات سنیے! ساتھ ہی چپکے سے کہہ دیتے کہ آپ سے سنا نہ جائے' ہمیں آپ کو سنانا مطلوب نہیں ہے۔ اس طرح وہ شانِ رسالت میں گستاخی کے مرتکب ہوتے۔

﴿وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ﴾ ''اور (کہتے ہیں) رَاعِنَا اپنی زبانوں کو موڑ کر''

رَاعِنَا کا مفہوم تو ہے ''ہماری رعایت کیجیے'' لیکن وہ اسے کھینچ کر رَاعِيْنَا بنا دیتے۔ یعنی اے ہمارے چرواہے!

﴿وَطَعْنًا فِی الدِّيْنِ ؕ﴾ ''اور دین میں طعن کرنے کے لیے۔''

یہود اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر ایسے کلمات کہتے اور پھر دین میں یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ

شخص واقعی نبی ہوتا تو ہمارا فریب اس پر ظاہر ہو جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو ظاہر کر دیا۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ﴾ ''اور اگر وہ یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی' اور آپ ہماری بات سن لیجیے' اور ذرا ہمیں مہلت دیجیے' تو یہ ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا اور بہت درست اور سیدھی بات ہوتی''

﴿وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ ''لیکن اللہ نے تو ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی ہے''

﴿فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٤٦﴾ ''تو اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں مگر شاذ ہی کوئی۔''

آیت ۴۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا﴾ ''اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی تھی! ایمان لاؤ اُس پر جو ہم نے نازل کیا ہے''

یہود کی شرارتوں پر لعنت و ملامت کے ساتھ ہی انہیں قرآن کریم پر ایمان کی دعوت بھی دی جا رہی ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ ''جو اُس کی تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے جو تمہارے پاس ہے''

﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ﴾ ''اس سے قبل کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں' پھر ان کو ان کی پیٹھوں کی طرف موڑ دیں''

یعنی چہرے اس طرح مسخ کر دیے جائیں کہ بالکل سپاٹ ہو جائیں' ان پر کوئی نشان باقی نہ رہے اور پھر انہیں پشت کی طرف موڑ دیا جائے کہ چہرہ پیچھے اور گدی سامنے ہو۔

﴿اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ﴾ ''یا ہم ان پر بھی اسی طرح لعنت کر دیں جس طرح ہم نے اصحابِ سبت پر لعنت کی تھی۔''

اصحابِ سبت کے واقعے کی تفصیل سورۃ الاعراف میں آئے گی' لیکن اجمالاً یہ واقعہ سورۃ البقرۃ میں آ چکا ہے۔

﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝٤٧﴾ ''اور اللہ کا حکم تو نافذ ہو کر رہنا ہے۔''

آیت ۴۸ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ﴾ ''یقیناً اللہ اس بات کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے''

﴿وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ﴾ ''اس سے کم تر جو کچھ ہے وہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔''

گویا یہ بھی کھلا لائسنس نہیں ہے کہ آپ سمجھ لیں کہ باقی سب گناہ تو معاف ہو ہی جائیں گے۔ اس کی اُمید دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی تمام گناہوں کو بغیر توبہ کے بھی معاف کرسکتا ہے' لیکن شرک کے معاف ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

﴿وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا﴾ ''اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے اس نے تو بہت بڑے گناہ کا افترا کیا۔''

اللہ تعالیٰ تو واحد و یکتا ہے۔ اُس کی ذات و صفات میں کسی اور کو شریک کرنا بہت بڑا جھوٹ' افترا اور بہتان ہے' اور عظیم ترین گناہ ہے۔

آیت ۴۹ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں؟''

یہاں یہود کے اُسی فلسفے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت پاک باز اور اعلیٰ و ارفع سمجھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ''We are the chosen people of the Lord''۔ سورۃ المائدۃ میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ﴾ (آیت ۱۸) یعنی ہم تو اللہ کے بیٹوں کی طرح ہیں بلکہ اس کے بہت ہی چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ ان کے نزدیک دوسرے تمام لوگ Goyems اور Gentiles ہیں' جو دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں' حقیقت میں حیوان ہیں۔ ان کو تو جس طرح چاہو لوٹ کر کھا جاؤ' جس طرح سے چاہو ان کو دھوکہ دو' ان کا استحصال کرو' ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہم ان کا قول پڑھ چکے ہیں: ﴿لَیۡسَ عَلَیۡنَا فِی الۡاُمِّیّٖنَ سَبِیۡلٌ﴾ (آیت ۷۵) ''ان اُمیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے''۔ ہم سے ان کے بارے میں کوئی محاسبہ اور کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ جیسے آپ نے گھوڑے کو تانگے میں جوت لیا یا ہرن کا شکار کر کے کھا لیا تو آپ سے اس پر کون مؤاخذہ کرے گا؟

﴿بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ ’’بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے‘‘

﴿وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾﴾ ’’اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

ان کو اگر پاکیزگی نہیں ملتی تو اس کا سبب ان کے اپنے کرتوت ہیں‘ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ فَتِیل دراصل اُس دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کے اندر گٹھلی کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں جو چھوٹی سے چھوٹی چیزیں لوگوں کے مشاہدے میں آتی تھیں ظاہر ہے کہ وہیں سے کسی چیز کے چھوٹا ہونے کے لیے مثال پیش کی جاسکتی تھی۔

آیت ۵۰ ﴿اُنۡظُرۡ کَیۡفَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ ؕ﴾ ’’دیکھو یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھ رہے ہیں؟‘‘

﴿وَکَفٰی بِهٖۤ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۵۰﴾﴾ ’’اور صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔‘‘

یعنی ان کی گرفت کے لیے اور ان کو عذاب دینے کے لیے یہی ایک بات کافی ہے جو انہوں نے گھڑی ہے۔

آیت ۵۱ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ﴾ ’’کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں کتاب میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا‘‘

﴿یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَالطَّاغُوۡتِ﴾ ’’وہ ایمان لاتے ہیں بتوں پر اور شیطان پر‘‘

﴿وَیَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا هٰۤؤُلَآءِ اَهۡدٰی مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِیۡلًا ﴿۵۱﴾﴾ ’’اور کہتے ہیں ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کفر کیا (یعنی مشرکین) کہ ان اہل ایمان سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں۔‘‘

یہود اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں اس حد تک پہنچ گئے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ محمد رسول اللہﷺ اور ان کے ساتھیؓ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ میں ان سے مشابہ تھے‘ پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان رکھتے تھے اور تورات کو اللہ کی کتاب مانتے تھے۔ لیکن اہل ایمان کے ساتھ ضدم ضدا اور عداوت میں وہ اس حد تک آگے بڑھے کہ مشرکین مکہ سے مل کر ان کے بتوں کی تعظیم کی اور کہا کہ یہ مشرک مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں اور ان کا دین

مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے۔

آیت ۵۲ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت فرما دی ہے۔''

﴿وَمَنۡ یَّلۡعَنِ اللّٰہُ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ نَصِیۡرًا ﴿۵۲﴾﴾ ''اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اُس کے لیے کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔''

آیت ۵۳ ﴿اَمۡ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡکِ﴾ ''کیا ان کا کوئی حصہ ہے اقتدار میں؟''

انہوں نے یہ جو تقسیم کر لی ہے کہ دنیا میں یہ سب کچھ ہمارے لیے ہے، باقی تمام انسان Goyems اور Gentiles ہیں، تو انسانوں میں یہ تقسیم اور تفریق کا اختیار انہیں کس نے دیا ہے؟ کیا ان کا اللہ کی حکومت میں کوئی حصہ ہے؟ زمین و آسمان کی بادشاہی تو اللہ کی ہے، مالک الملک اللہ ہے۔ تو کیا ان کو اُس کے پاس سے کوئی اختیار ملا ہوا ہے؟

﴿فَاِذًا لَّا یُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِیۡرًا ﴿۵۳﴾﴾ ''اگر ایسا کہیں ہوتا تو یہ دوسرے لوگوں کو تل کے برابر بھی کوئی شے دینے کو تیار نہ ہوتے۔''

آیت ۵۴ ﴿اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ﴾ ''کیا یہ حسد کر رہے ہیں لوگوں سے اس پر کہ جو اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے عطا کر دیا ہے؟''

دراصل یہ سب اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں کہ اللہ نے ان اُمیین میں اپنا آخری نبی بھیج دیا اور انہیں اپنی آخری کتاب عطا فرما دی جنہیں یہ حقیر سمجھتے تھے۔ اب یہ اس حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔

﴿فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَاٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ﴿۵۴﴾﴾ ''تو ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور انہیں بہت بڑی حکومتیں بھی دیں۔''

یعنی تمہیں بھی اگر تورات اور انجیل ملی تھی تو ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہونے کے ناتے سے ملی تھی، تو یہ جو اسماعیلؑ کی نسل ہے یہ بھی تو ابراہیمؑ ہی کی نسل ہے۔ ہاں بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت علیحدہ علیحدہ ملی۔ تورات کتاب تھی اور انجیل حکمت تھی، جبکہ یہاں کتاب اور حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جگہ پر قرآن میں بتمام و کمال جمع کر دی ہیں۔ مزید برآں جیسے ان کو مُلکِ عظیم دیا تھا، اب ہم ان مسلمانوں کو اس سے بڑا ملک دیں گے۔ یہ مضمون سورۃ النور میں آئے گا:

﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (آیت ۵۵) ''ہم لازماً ان اہل ایمان کو دنیا میں حکومت اور خلافت عطا کریں گے جیسے ان سے پہلوں کو عطا کی تھی۔''

آیت ۵۵ ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ﴾ ''پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اس پر ایمان لے آئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو اس سے رُک گئے ہیں۔''

﴿وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾﴾ ''اور ایسے لوگوں کے لیے تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آ گ ہی کافی ہے۔''

آیت ۵۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ﴾ ''یقیناً جو لوگ ہماری آیات کا کفر کریں گے ایک وقت آئے گا کہ ہم انہیں آ گ میں جھونک دیں گے۔''

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ ''اور جب بھی ان کی کھالیں جل جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے''

﴿لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ﴾ ''تا کہ وہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں۔''

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے جسے میڈیکل سائنس نے دریافت کیا ہے کہ درد کا احساس انسان کی کھال (skin) ہی میں ہے۔ اس کے نیچے گوشت اور عضلات وغیرہ میں درد کا احساس نہیں ہے۔ کسی کو چٹکی کاٹی جائے' کانٹا چبھے' چوٹ لگے یا کوئی حصہ جل جائے تو تکلیف اور درد کا سارا احساس جلد ہی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ان جہنمیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب بھی ان کی کھال آتش جہنم سے جل جائے گی تو اس کی جگہ نئی کھال دے دی جائے گی تا کہ ان کی تکلیف اور سوزش مسلسل رہے' جلن کا احساس برقرار رہے' اس میں کمی نہ ہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾﴾ ''یقیناً اللہ زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔''

آیت ۵۷ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے''

یہاں بھی وہی فوری تقابل (simultaneous contrast) ہے کہ اہل جہنم کے تذکرے کے فوراً بعد اہل جنت کا تذکرہ ہے۔

﴿سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''عنقریب انہیں ہم داخل کریں گے ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا﴾ ’’وہ رہیں گے ان میں ہمیشہ ہمیش۔‘‘
﴿لَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ ’’ان کے لیے اس میں ہوں گی بڑی پاک باز بیویاں‘‘
﴿وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِیۡلًا ﴿۵۷﴾﴾ ’’اور ہم انہیں داخل کریں گے گھنی چھاؤں میں۔‘‘
انہیں ایسی گہری اور ٹھنڈی چھاؤں میں رکھا جائے گا جو دھوپ کی حدت اور تمازت سے بالکل محفوظ ہوگی۔

یہاں وہ حصہ ختم ہوا جس میں اہل کتاب کی طرف روئے سخن تھا۔ اب پھر مسلمانوں سے خطاب ہے۔

آیات ۵۸ تا ۷۰

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۙ وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ
اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ سَمِیۡعًۢا
بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ
مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ
بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ
یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ
یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِهٖ ؕ وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ
یُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۶۰﴾ وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی
الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾ فَکَیۡفَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ
مُّصِیۡبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ ثُمَّ جَآءُوۡکَ یَحۡلِفُوۡنَ ٭ۖ بِاللّٰهِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ
اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِیۡقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُ اللّٰهُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ ٭ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ
وَعِظۡهُمۡ وَقُلۡ لَّهُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًۢا بَلِیۡغًا ﴿۶۳﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا
لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ
وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّکَ لَا
یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ

حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾ وَلَوۡ اَنَّا کَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا
اَنۡفُسَکُمۡ اَوِاخۡرُجُوۡا مِنۡ دِیَارِکُمۡ مَّا فَعَلُوۡہُ اِلَّا قَلِیۡلٌ مِّنۡہُمۡ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ
فَعَلُوۡا مَا یُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَاَشَدَّ تَثۡبِیۡتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ
لَّدُنَّاۤ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَہَدَیۡنٰہُمۡ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ
وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ
وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِکَ الۡفَضۡلُ مِنَ اللّٰہِ
وَکَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیۡمًا ﴿۷۰﴾

یہ دو آیات (۵۸'۵۹) قرآن مجید کی نہایت اہم آیات ہیں' جن میں اسلام کا سارا سیاسی' قانونی اور دستوری نظام موجود ہے۔ فرمایا:

آیت ۵۸ ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا﴾ ''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو''

﴿وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ﴾ ''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ جو بھی سیاسی نظام بناتے ہیں اس میں مناصب ہوتے ہیں' جن کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اور اختیارات بھی۔ لہٰذا ان مناصب کے انتخاب میں آپ کی رائے کی حیثیت امانت کی ہے۔ آپ اپنی رائے دیکھ بھال کر دیں کہ کون اس کا اہل ہے۔ اگر آپ نے ذات برادری' رشتہ داری وغیرہ کی بنا پر یا مفادات کے لالچ میں یا کسی کی دھونس کی وجہ سے کسی کے حق میں رائے دی تو یہ صریح خیانت ہے۔ حقِ رائے دہی ایک امانت ہے اور اس امانت کا استعمال صحیح صحیح ہونا چاہیے۔ عام معنی میں بھی امانت کی حفاظت ضروری ہے اور جو بھی امانت کسی نے رکھوائی ہے اسے واپس لوٹانا آپ کی شرعی ذمہ داری ہے۔ لیکن یہاں یہ بات اجتماعی زندگی کے اہم اصولوں کی حیثیت سے آ رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ گویا پہلی ہدایت سیاسی نظام سے متعلق ہے کہ امیر المؤمنین یا سربراہِ ریاست کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر ہوگا' جبکہ دوسری ہدایت عدلیہ (Judiciary) کے استحکام کے بارے میں ہے کہ وہاں بلا امتیاز ہر ایک کو عدل و انصاف

میسر آئے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ﴾ ''یقیناً یہ بہت ہی اچھی نصیحتیں ہیں جو اللہ تمہیں کر رہا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اگلی آیت میں تیسری ہدایت مقنّنہ (Legislature) کے بارے میں آ رہی ہے کہ اسلامی ریاست کی دستوری بنیاد کیا ہو گی۔ جدید ریاست کے تین ستون انتظامیہ (Executive)، عدلیہ (Judiciary) اور مقنّنہ (Legislature) گنے جاتے ہیں۔ پہلی آیت میں انتظامیہ اور عدلیہ کے ذکر کے بعد اب دوسری آیت میں مقنّنہ کا ذکر ہے کہ قانون سازی کے اصول کیا ہوں گے۔ فرمایا:

آیت ۵۹ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ ''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی'' ّ ّ

یعنی کوئی قانون اللہ اور اس کے رسول کی منشا کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا۔ اصولی طور پر یہ بات پاکستان کے دستور میں بھی تسلیم کی گئی ہے:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

لیکن اس کی تنفیذ وتعمیل کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے، لہٰذا اس وقت ہمارا دستور منافقت کا پلندہ ہے۔ اس آیت کی رو سے اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام قانون سازی کے دو مستقل ذرائع (sources) ہیں۔ اس طرح یہاں منکرین سنت کی نفی ہوتی ہے جو مؤخر الذکر کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا:

﴿وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔''

یہاں بہت عجیب اسلوب ہے کہ تین ہستیوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے: اللہ کی، رسول کی اور اولوالامر کی، لیکن پہلے دو کے لیے ''اَطِیۡعُوۡا'' کا لفظ آیا ہے، جبکہ تیسرے کے لیے نہیں ہے۔ ایک اسلوب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ''اَطِیۡعُوۡا'' ایک مرتبہ آ جاتا اور اس کا اطلاق تینوں پر ہو جاتا: ''یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ''۔ اس طرح تینوں

برابر ہو جاتے۔ دوسرا اسلوب یہ ہوسکتا تھا کہ ''اَطِیْعُوا'' تیسری مرتبہ بھی آ تا: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِیْعُوْا اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ''۔لیکن قرآن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے کہ ''اَطِیْعُوا'' دو کے ساتھ ہے' تیسرے کے ساتھ نہیں ہے' اس سے اولوالامر کی اطاعت کا مرتبہ (status) متعین ہو جاتا ہے۔ایک تو ''مِنْکُمْ'' کی شرط سے واضح ہو گیا کہ اولوالامر تم ہی میں سے ہونے چاہئیں' یعنی مسلمان ہوں۔ غیر مسلم کی حکومت کو ذہناً تسلیم کرنا اللہ سے بغاوت ہے۔ وہ کم از کم مسلمان تو ہوں۔ پھر یہ کہ متذکرہ بالا اسلوب سے واضح ہو گیا کہ ان کی اطاعت مطلق' دائم اور غیر مشروط نہیں۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق' دائم' غیر مشروط اور غیر محدود ہے' لیکن صاحبِ امر کی اطاعت اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہوگی۔ وہ جو حکم بھی لائے اسے بتانا ہوگا کہ میں کتاب وسنت سے کیسے اس کا استنباط کر رہا ہوں۔ گویا اسے کم از کم یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ حکم کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہے۔ ایک مسلمان ریاست میں قانون سازی اسی بنیاد پر ہوسکتی ہے۔ دورِ جدید میں قانون ساز ادارہ کوئی بھی ہو' کانگریس ہو' پارلیمنٹ ہو یا مجلس ملی ہو' وہ قانون سازی کرے گی' لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ یہ قانون سازی قرآن وسنت سے متصادم نہ ہو۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ ''پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے''

ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اولوالامر کہے کہ میں تو اسے عین اسلام کے مطابق سمجھتا ہوں' لیکن آپ کہیں کہ نہیں' یہ بات خلافِ اسلام ہے' تو اب کہاں جائیں؟ فرمایا:

﴿فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف''

یعنی اب جو بھی اپنی بات ثابت کرنا چاہتا ہے اسے اللہ اور اس کے رسول سے یعنی قرآن وسنت سے دلیل لانی پڑے گی۔ میری پسند' میرا خیال' میرا نظریہ والا استدلال قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ استدلال کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول کی مرضی ہوگی۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ ابھی یہاں ایک خلا ہے۔ وہ خلا یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فریقین میں سے کس کی رائے صحیح ہے۔اور آج کے ریاستی نظام میں آ کر وہ خلا پُر ہو چکا ہے کہ یہ عدلیہ (Judiciary) کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب عرب میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اس طرح علیحدہ علیحدہ ریاستی ادارے ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئے تھے اور ان کی الگ الگ

شناخت نہیں تھی کہ یہ مقنّنہ (Legislature) ہے‘ یہ عدلیہ (Judiciary) ہے اور یہ انتظامیہ (Executive) ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو کوئی قاضی تھے ہی نہیں۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شعبہ قضاء شروع کیا۔ تو رفتہ رفتہ یہ ریاستی ادارے پروان چڑھے۔ جدید دور میں ان تنازعات کے حل کا ادارہ عدلیہ ہے۔ وہاں ہر شخص جائے اور اپنی دلیل پیش کرے۔ علماء جائیں‘ قانون دان جائیں اور سب جا کر دلائل دیں۔ وہاں سے فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ بات واقعتاً قرآن وسنت سے متصادم ہے یا نہیں۔

﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ﴾ ’’اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

﴿ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ﴿۵۹﴾﴾ ’’یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی بہت مفید ہے۔‘‘

آگے پھر منافقین کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اس سورۂ مبارکہ کا سب سے بڑا حصہ منافقین سے خطاب اور ان کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

آیت ۶۰ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ﴾ ’’کیا تم نے غور نہیں کیا اُن لوگوں کی طرف جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اُس پر بھی جو (اے نبیؐ!) آپؐ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا‘‘

لیکن ان کا طرزِ عمل یہ ہے کہ:

﴿يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ﴾ ’’وہ چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمات کے فیصلے طاغوت سے کروائیں‘‘

یہاں واضح طور پر ’’طاغوت‘‘ سے مراد وہ حاکم یا وہ ادارہ ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ پچھلی آیت میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ گویا جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند ہو گیا وہ طاغوت سے خارج ہو گیا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو قبول نہیں کرتا وہ طاغوت ہے‘ اس لیے کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر گیا۔ چنانچہ غیر مسلم حاکم یا منصف جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا پابند نہیں وہ طاغوت ہے۔

﴿وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ﴾ ''حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا کفر کریں۔''

منافقین مدینہ کی عام روش یہ تھی جس مقدمہ میں انہیں اندیشہ ہوتا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اسے نبی اکرمﷺ کی خدمت میں لانے کے بجائے یہودی عالموں کے پاس لے جاتے۔ وہ جانتے تھے کہ حضورﷺ کے پاس جائیں گے تو حق اور انصاف کی بات ہوگی۔ ایک یہودی اور ایک مسلمان جو منافق تھا‘ ان کا آپس میں جھگڑا ہوگیا۔ یہودی کہنے لگا کہ چلو محمد (ﷺ) کے پاس چلتے ہیں۔ اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ میں حق پر ہوں۔ لیکن یہ منافق کہنے لگا کہ کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں جو ایک یہودی عالم تھا۔ بہرحال وہ یہودی اس منافق کو رسول اللہﷺ کے پاس لے آیا۔ آپؐ نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ وہاں سے باہر نکلے تو منافق نے کہا کہ چلو اب حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں‘ وہ جو فیصلہ کر دیں وہ مجھے منظور ہوگا۔ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ منافق کو یہ امید تھی کہ حضرت عمرؓ میرا زیادہ لحاظ کریں گے‘ کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ جب یہودی نے یہ بتایا کہ اس مقدمے کا فیصلہ رسول اللہﷺ میرے حق میں کر چکے ہیں تو حضرت عمرؓ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ‘ تلوار لی اور اس منافق کی گردن اڑا دی کہ جو محمدؐ رسول اللہﷺ کے فیصلے پر راضی نہیں ہے اور اس کے بعد مجھ سے فیصلہ کروانا چاہتا ہے اس کے حق میں میرا یہ فیصلہ ہے! اس پر اس منافق کے خاندان والوں نے بڑا واویلا مچایا۔ وہ چیختے چلاتے ہوئے رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مقتول حضرت عمرؓ کے پاس یہودی کو لے کر اس وجہ سے گیا تھا کہ وہ اس معاملہ میں باہم مصالحت کرا دیں‘ اس کے پیش نظر رسول اللہﷺ کے فیصلے سے انکار نہیں تھا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی گئی۔

﴿وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۶۰﴾﴾ ''اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بہت دور کی گمراہی میں ڈال دے۔''

آیت ۶۱ ﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور آؤ رسول کی طرف'' اپنے مقدمات کے فیصلے اللہ کے رسولﷺ سے کراؤ۔

﴿رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾﴾ ''تو (اے نبی!) آپ دیکھتے ہیں کہ یہ منافق آپ کے پاس آنے سے کنی کتراتے ہیں۔''

صَدَّ یَصُدُّ کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ رُکنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور روکنے کے معنی میں بھی۔

آیت ۶۲ ﴿فَکَیۡفَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ﴾ ''پھراُس وقت کیا ہوا جب ان پر کوئی مصیبت آ گئی ان کے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کی وجہ سے''

وہ چیختے چلاتے آئے کہ عمر نے ہمارا آدمی مار ڈالا‘ ہمیں اس کا قصاص دلایا جائے۔

﴿ثُمَّ جَآءُوۡکَ یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ﴾ ''پھر وہ آپ کے پاس آئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے''

﴿اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِیۡقًا ﴿۶۲﴾﴾ ''کہ ہم تو صرف بھلائی اور موافقت چاہتے تھے۔''

ہم تو عمرؓ کے پاس محض اس لیے گئے تھے کہ کوئی مصالحت اور راضی نامہ ہو جائے۔

آیت ۶۳ ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُ اللّٰہُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اسے جانتا ہے۔''

﴿فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ﴾ ''تو (اے نبی!) آپ ان سے چشم پوشی کیجیے''

﴿وَعِظۡہُمۡ﴾ ''اور ان کو ذرا نصیحت کیجیے''

﴿وَقُلۡ لَّہُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ قَوۡلًۢا بَلِیۡغًا ﴿۶۳﴾﴾ ''اور ان سے خود ان کے بارے میں ایسی بات کہیے جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔''

یہ آیات نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بری قرار دیا کہ اللہ کی طرف سے ان کی براءت آ گئی ہے‘ اور اسی دن سے ان کا لقب ''فاروق'' قرار پایا‘ یعنی حق و باطل میں فرق کر دینے والا۔

اب ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ اس سورۂ مبارکہ میں منافقت جو زیر بحث آئی ہے وہ تین عنوانات کے تحت ہے۔ منافقوں پر تین چیزیں بہت بھاری تھیں‘ جن میں سے اوّلین رسول اللہ ﷺ کی اطاعت تھی۔ اور یہ بڑی نفسیاتی بات ہے۔ ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کی

اطاعت بڑا مشکل کام ہے۔ ہم جو رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے ایک ادارے (institution) کی حیثیت رکھتے ہیں' رسولؐ شخصاً ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ جبکہ ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ شخصاً موجود تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کے بھی دو ہاتھ ہیں' دو پاؤں ہیں' دو آنکھیں ہیں' لہٰذا بظاہر اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت ان پر بہت شاق تھی۔ جیسا کہ جماعتوں میں ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت بہت شاق گزرتی ہے' یہ بڑا مشکل کام ہے۔ امیر کی رائے پر چلنے کے لیے اپنی رائے کو پیچھے ڈالنا پڑتا ہے۔ جو صادق الایمان مسلمان تھے انہیں تو یہ یقین تھا کہ یہ محمد بن عبداللہ جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں' حقیقت میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہیں اور ہم ان کی اسی حیثیت میں ان پر ایمان لائے ہیں۔ لیکن جن کے دلوں میں یہ یقین نہیں تھا یا کمزور تھا ان کے لیے حضور ﷺ کی شخصی اطاعت بڑی بھاری اور بڑی کٹھن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر وہ کہتے تھے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنے پاس سے کہہ رہے ہیں۔ کیوں نہیں کوئی سورت نازل ہو جاتی؟ کیوں نہیں کوئی آیت نازل ہو جاتی؟ اور سورۂ محمدؐ اسی انداز میں نازل ہوئی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ نے خود اپنی طرف سے اقدام کر دیا ہے۔ اس پر اللہ نے کہا کہ لو پھر ہم قتال کی آیات نازل کر دیتے ہیں۔ دوسری چیز جو اُن پر کٹھن تھی وہ ہے قتال' یعنی اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا۔ ان کا حال یہ تھا کہ ع مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز! تیسری کٹھن چیز ہجرت تھی۔ اس کا اطلاق منافقین مدینہ پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مکہ اور اردگرد کے جو منافق تھے ان پر ہوتا تھا۔ ان کا ذکر بھی آگے آئے گا۔ ظاہر ہے گھر بار اور خاندان والوں کو چھوڑ کر نکل جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اب سب سے پہلے اطاعتِ رسولؐ کی اہمیت بیان کی جا رہی ہے:

آیت ۶۴ ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔''

﴿وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ﴾ ''اور اگر وہ' جبکہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا' آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے''

﴿فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ﴾ ''اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتے''

﴿لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ۝﴾ ''تو وہ یقیناً اللہ کو بڑا توبہ قبول فرمانے والا

اور رحم کرنے والا پاتے۔‘‘

آیت ۶۵ ﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ﴾ ’’پس نہیں، آپ کے رب کی قسم! یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ کو حَکم نہ مانیں اُن تمام معاملات میں جو ان کے مابین پیدا ہو جائیں‘‘

اس میں انہیں کوئی اختیار (choice) حاصل نہیں ہے۔ ان کے مابین جو بھی نزاعات اور اختلافات ہوں ان میں اگر یہ آپ کو حَکم نہیں مانتے تو آپ کے رب کی قسم یہ مؤمن نہیں ہیں۔ کلامِ الٰہی کا دوٹوک اور پُرجلال انداز ملاحظہ کیجیے۔

﴿ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ﴾ ’’پھر جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں‘‘

اگر آپؐ کا فیصلہ قبول بھی کر لیا، لیکن دل کی تنگی اور کدورت کے ساتھ کیا تب بھی یہ مؤمن نہیں ہیں۔

﴿وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۶۵﴾﴾ ’’اور سرِ تسلیم خم کریں، جیسے کہ سرِ تسلیم خم کرنے کا حق ہے۔‘‘

واضح رہے کہ یہ حکم صرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ قیامت تک کے لیے ہے۔

آیت ۶۶ ﴿وَلَوۡ اَنَّا کَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ﴾ ’’اور اگر ہم نے ان پر یہ فرض کر دیا ہوتا کہ قتل کرواپنے آپ کو‘‘

﴿اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ دِیَارِکُمۡ﴾ ’’یا نکلو اپنے گھروں سے‘‘

﴿مَّا فَعَلُوۡہُ اِلَّا قَلِیۡلٌ مِّنۡہُمۡ﴾ ’’تو یہ اس کی تعمیل نہ کرتے سوائے ان میں سے چند ایک کے۔‘‘

﴿وَلَوۡ اَنَّہُمۡ فَعَلُوۡا مَا یُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ﴾ ’’اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ان کو نصیحت کی جا رہی ہے‘‘

اس کا ترجمہ اس طرح بھی کیا گیا ہے: ’’اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی انہیں ہدایت کی جاتی‘‘، یعنی اپنے آپ کو قتل کرنا اور اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہونا۔

﴿لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ وَاَشَدَّ تَثۡبِیۡتًا ﴿۶۶﴾﴾ ’’تو یہی ان کے لیے بہتر ہوتا اور انہیں

دین پر ثابت قدم رکھنے والا ہوتا۔''

آیت ٦٧ ﴿وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّـآ اَجْرًا عَظِيْمًا﴿٦٧﴾﴾ ''اور اس صورت میں ہم انہیں اپنے پاس سے بہت بڑا اجر دیتے۔''

آیت ٦٨ ﴿وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴿٦٨﴾﴾ ''اور انہیں ہدایت فرما دیتے سیدھی راہ کی طرف۔''

اکثر مفسرین نے اس آیت کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ حکم دے کہ اپنے آپ کو قتل کرو' خودکشی کرو' تو ہمیں یہ کرنا ہو گی۔ اگر اللہ تعالیٰ حکم دے کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو نکلنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق و مالک ہے۔ اس کی طرف سے دیا گیا ہر حکم واجب التعمیل ہے۔ البتہ ﴿اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کے الفاظ میں ایک مزید اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۵۴) میں ہم تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے پڑھ آئے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی ان کو مرتد ہونے کی جو سزا دی گئی تھی اس کے لیے یہی الفاظ آئے تھے: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''پس قتل کرو اپنے آپ کو''۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو قتل کرو جنہوں نے اس کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ منافقین کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی حمایت میں اکثر و بیشتر ان کے خاندان والے' رشتہ دار' ان کے گھرانے والے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ تو یہاں شاید یہ بتایا جا رہا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ان کی حمایت کرو' تمہارا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس ہونا چاہیے کہ تم اپنے اندر سے خود دیکھو کہ کون منافق ہیں جو اصل میں آستین کے سانپ ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم نہیں دیا' مگر وہ یہ حکم بھی دے سکتا تھا کہ ہر گھرانہ اپنے ہاں کے منافقین کو خود قتل کرے۔ یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غیرتِ ایمانی کی وجہ سے اس منافق کو قتل کیا تھا' جبکہ اُس منافق کے خاندان کے لوگ حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کر رہے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا تو یہ بھی تمہیں کرنا چاہیے تھا' لیکن یہ اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں سے بہت کم لوگ ہوتے جو اس حکم کی تعمیل کرتے۔ اور اگر وہ یہ کر گزرتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور ان کے ثباتِ قلبی اور ثباتِ ایمانی کا باعث ہوتا۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ انہیں خاص اپنے پاس سے اجرِ عظیم عطا فرماتا اور انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرماتا۔

اب جو آیت آ رہی ہے یہ اطاعتِ رسول کے موضوع پر قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت

ہے۔فرمایا:

آیت۶۹ ﴿وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ﴾ ’’اور جوکوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا‘‘

﴿مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ﴾ ’’یعنی انبیاء کرام‘ صدیقین‘ شہداء اور صالحین۔‘‘

﴿وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا﴾ ’’اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے۔‘‘

یعنی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرنے والوں کا شمار ان لوگوں کے زمرے میں ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔سورۃ الفاتحہ میں ہم نے یہ الفاظ پڑھے تھے: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ آیت زیر مطالعہ ’’اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ‘‘ کی تفسیر ہے۔ان مراتب کو ذرا سمجھ لیجیے۔صالح مسلمان گویا baseline پر ہے۔وہ ایک نیک نیت مسلمان ہے جس کے دل میں خلوص کے ساتھ ایمان ہے۔وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام پر عمل کر رہا ہے‘ محرّمات سے بچا ہوا ہے۔وہ اس سے اوپر اٹھے گا تو ایک اونچا درجہ شہداء کا ہے‘ اس سے بلند تر درجہ صدیقین کا ہے اور بلند ترین درجہ انبیاء کا ہے۔اس بلند ترین درجے پر تو کوئی نہیں پہنچ سکتا‘ اس لیے کہ وہ کوئی کسبی چیز نہیں ہے‘ وہ تو ایک وہبی چیز تھی‘ جس کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہے۔البتہ مرتبہ صالحیت سے بلند تر دو درجے ابھی موجود ہیں کہ انسان اپنی ہمت‘ محنت اور کوشش سے شہادت اور صدیقیت کے مراتب پر فائز ہوسکتا ہے۔یہ مضمون ان شاء اللہ سورۃ الحدید میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوگا۔

آیت۷۰ ﴿ذٰلِكَ الۡفَضۡلُ مِنَ اللّٰهِ﴾ ’’یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے۔‘‘

یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اُن پر کہ جنہیں آخرت میں انبیاء کرام‘ صدیقینِ عظام‘ شہداء اور صالحین کی معیت حاصل ہو جائے۔اس کے لیے دُعا کرنی چاہیے: وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ اے اللہ ہمیں موت دیجیو اپنے وفادار و نیکوکار بندوں کے ساتھ!

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيۡمًا﴾ ’’اور اللہ کافی ہے ہر شے کے جاننے کے لیے۔‘‘

یعنی کون کس استعداد کا حامل ہے اور کس قدر و منزلت کا مستحق ہے‘ اللہ خوب جانتا ہے۔حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔○○

مالاکنڈ کی اہمیت اور اس کا مستقبل

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۲۷ستمبر ۲۰۰۹ء کا خطاب

بمقام قرآن آڈیٹوریم' نیوگارڈن ٹاؤن لاہور

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿**هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ**﴾

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸'الصف:۹)

﴿**وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا**....﴾(سبا:۲۸)

وَعَنۡ ثَوۡبَانَ ﷛ مَوۡلَی النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ:

((**اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الۡاَرۡضَ فَرَأَیۡتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا' وَاِنَّ اُمَّتِیۡ سَیَبۡلُغُ مُلۡکُهَا مَا زُوِیَ لِیۡ مِنۡهَا**)) (رواہ مسلم والترمذی وابوداوٗد وابن ماجہ)

وَعَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ الۡحَارِثِ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ:

((**یَخۡرُجُ نَاسٌ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَیُوَطِّئُوۡنَ لِلۡمَهۡدِیِّ یَعۡنِیۡ سُلۡطَانَہٗ**))

(رواہ ابن ماجہ)

عَنۡ اَبِیۡ هُرَیۡرَۃَ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ:

((**تَخۡرُجُ مِنۡ خُرَاسَانَ رَایَاتٌ سُوۡدٌ' فَلَا یَرُدُّهَا شَیۡئٌ حَتّٰی تُنۡصَبَ بِاِیۡلِیَاءَ**))

(رواہ الترمذی)

وَعَنۡ ثَوۡبَانَ ﷛ مَوۡلٰی رسولِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہ ﷺ:

((عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِیْ اَحْرَزَھُمَا اللّٰہُ مِنَ النَّارِ‘ عِصَابَۃٌ تَغْزُو الْھِنْدَ وَعِصَابَۃٌ تَکُوْنُ مَعَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ عَلَیْھِمَا السَّلَامُ))(رواہ النسائی)

میرا آج کا عنوان ہے: ”مالاکنڈ کی اہمیت اور اس کا مستقبل“۔ اس عنوان کے پس منظر میں ہم یہ جائزہ لیں گے کہ مالاکنڈ‘ سوات اور اردگرد کے علاقے میں جو آرمی آپریشن کیا گیا‘ آیا وہ صحیح تھا یا غلط‘ اور اس کا کوئی جواز تھا یا نہیں؟ بظاہر یہ آپریشن کامیاب نظر آ رہا ہے‘ لیکن کیا یہ کامیابی مستقل ہے یا عارضی؟ اور اس میں کیا کیا امکانات ابھی مضمر ہیں؟

اپنے موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ چند چیزیں آپ کے علم میں آ جائیں۔

مالاکنڈ کی مذہبی اہمیت

مالاکنڈ ڈویژن پاکستان کے انتہائی شمال مغربی کونے میں ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ اسرائیل کے بارے میں‘ میں نے ایک انگریزی رسالے میں یہ الفاظ پڑھے تھے:

"Too small a geography but too long history."

اسرائیل ایک ایسا علاقہ ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے بہت چھوٹا ہے‘ ہماری سابقہ ریاست بہاولپور کے برابر اس کا رقبہ ہے‘ لیکن اس کی تاریخ بہت پرانی ہے‘ یعنی چار ہزار سال پرانی تاریخ ہے۔ اور یہ تاریخ تورات کی وجہ سے محفوظ ہے‘ حالانکہ اور بھی پانچ چھ ہزار سال پرانی تہذیبیں ہیں جن کا سراغ تو ملتا ہے لیکن ان کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اسرائیل کی طرح مالاکنڈ کے علاقے کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے:

"Too small a territory but too big importance religiously."

یعنی مالاکنڈ کا علاقہ چھوٹا سا ہے مگر مذہبی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ”دریائے کابل سے دریائے یرموک تک“ میں مصری دانشور ومؤرخ علامہ شکیب ارسلان کا قول نقل کیا ہے‘ جنہوں نے مالاکنڈ اور اس کے گردونواح میں بسنے والے قبائل کے بارے میں کہا ہے: ”اگر ساری

دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے، پھر بھی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا، اور اس کا عزم جوان رہے گا''۔ ویسے تو بحیثیت مجموعی پختون لوگوں میں ہمارے دوسرے صوبوں کی بنسبت مذہبیت بہت زیادہ ہے، مثلاً نماز روزہ کی پابندی، شعائرِ اسلام اور داڑھی وغیرہ کا جتنا اہتمام اس علاقہ میں ہے، اتنا اہتمام آپ کو پنجاب، سندھ، کراچی اور لاہور میں نظر نہیں آئے گا۔ اور پھر خاص طور پر یہ آزاد قبائلی علاقے، ان کے ہاں ابھی بھی وہی نظام چل رہا ہے کہ جرگہ بیٹھتا ہے اور فیصلے شریعت کے مطابق ہو جاتے ہیں، کسی پرچے، پولیس اور عدالتوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

مالاکنڈ کا جغرافیائی محلِ وقوع

اب بات کرتے ہیں مالاکنڈ کے جغرافیائی محلِ وقوع کی۔ ایشیا کے تقریباً وسط میں ایک جگہ ''سطح مرتفع پامیر'' ہے، جسے دنیا کی چھت (roof of the world) کہا جاتا ہے۔ اس جگہ سے پانچ سلسلہ ہائے کوہ نکلتے ہیں۔

(۱) جنوب مشرق میں کوہِ ہمالیہ آتا ہے۔

(۲) جنوب مغرب میں کوہِ ہندوکش آتا ہے۔

(۳) کوہِ قراقرم، مشرق میں جاتا ہے۔

(۴) پھر ایک سلسلہ شمال مشرق سے چین کی طرف جاتا ہے، خاص طور پر چینی ترکستان کے علاقے کی طرف جہاں چین کا مشہور شہر تاشقند ہے۔

(۵) پانچواں سلسلہ شمال مغرب سے روسی ترکستان کی طرف جاتا ہے، جس میں ہمارے بڑے پرانے شہر سمرقند اور بخارا ہیں۔

ان پانچ سلسلہ ہائے کوہ میں سے آخری تین یعنی شمال مشرقی، شمال مغربی اور کوہِ قراقرم کو ذہن سے نکال دیجیے۔ باقی جو پہلے دو سلسلہ ہائے کوہ ہیں یعنی جنوب مشرق کی طرف کوہِ ہمالیہ اور جنوب مغرب کی طرف کوہِ ہندوکش، ان کے درمیان ایک علاقہ بنتا ہے جو نیچے کی طرف پھیلتا جاتا ہے۔ (اوپر سے یہ سطح مرتفع پامیر کے ساتھ جڑا ہوا

2

ہے‘ جبکہ) نیچے میدانی علاقہ آ جاتا ہے جس میں وادیاں بھی ہیں‘ کوہستان بھی ہیں۔ اس علاقے میں کچھ دور جانے کے بعد جنوب کی طرف آ جائیں‘ جبکہ کوہِ ہمالیہ اپنا رُخ مکمل طور پر مشرق کی طرف کر دیتا ہے اور کوہِ ہندوکش اپنا رُخ زیادہ تر مغرب کی طرف کر دیتا ہے‘ وہاں پر اس کے base کے طور پر کوہِ مالاکنڈ ہے۔ اس طرح ایک مثلث بن گئی ہے۔ اِدھر سے کوہِ ہمالیہ‘ اُدھر سے کوہِ ہندوکش اور نیچے سے کوہِ مالاکنڈ۔ یہ جو مالاکنڈ ہے یہ اصل میں آج مالاکنڈ ڈویژن کہلاتا ہے۔

مالاکنڈ‘ تقسیم ہندوستان سے قبل و بعد

پاکستان بننے سے پہلے یہاں تین ریاستیں قائم تھیں جو اُس زمانے میں Princely states کہلاتی تھیں‘ جیسے ہمارے ہاں اور بھی ایسی ریاستیں تھیں جہاں انگریز کا کنٹرول تھا‘ لیکن سربراہِ ریاست مسلمان تھے‘ مثلاً بہاولپور کی ریاست انگریز کے کنٹرول میں تھی لیکن وہاں کے نواب صاحب نواب بہاولپور کہلاتے تھے۔ اسی طرح نواب حیدر آباد دکن‘ راجہ کشمیر وغیرہ۔ اسی طرح یہاں بھی تین ریاستیں تھیں۔ (۱) ریاست سوات‘ جو سب سے بڑی‘ سب سے زیادہ زرخیز اور سب سے زیادہ متمدن تھی۔ (۲) ریاست چترال (۳) ریاست دِیر۔ یہ تین ریاستیں اور ان کے علاوہ وہ علاقہ جو آج کل باجوڑ کہلاتا ہے‘ یہ سارا علاقہ چار خوانین میں تقسیم تھا۔ وہاں نواب نہیں‘ خان ہوتے تھے۔ اس علاقے میں تین قومیں اور مختلف قبیلے آباد تھے۔ اسے بعد میں ایک علیحدہ ایجنسی بنا دیا گیا اور اب یہ سارا علاقہ مالاکنڈ ایجنسی کہلاتا ہے۔ جب تک یہ تینوں ریاستیں (سوات‘ چترال‘ دیر) موجود تھیں تو ان تمام ریاستوں کو کنٹرول کرنے والا پولیٹکل ایجنٹ اسی مالاکنڈ میں رہتا تھا۔ گویا اس زمانے میں مالاکنڈ سرکاری طور پر ان ریاستوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں یہ ریاستیں ختم کر دی گئیں اور پاکستان میں ضم ہو گئیں۔ سوات سب سے بڑی ریاست تھی‘ اس کے تین ضلعے بن گئے‘ سوات‘ شانگلہ اور بونیر۔ ان کے علاوہ ایک علاقہ اوپر ہے جو کوہستانِ سوات کہلاتا ہے۔ دیر کے دو ضلعے بن گئے‘

اَپر دیر اور لوئر دیر۔ ان کے علاوہ اوپر شمال میں ایک علاقہ ہے جو کوہستانِ دیر کہلاتا ہے۔ جبکہ چترال ایک ضلع کی حیثیت سے برقرار رہا۔ وہ ویسے بھی بالکل دور دراز کا علاقہ ہے' جہاں تک جانا اور پہنچنا بہت دشوار گزار ہے۔ اور وہ لوگ پختون بھی نہیں ہیں۔ ان کی نسل بھی کچھ مختلف ہے اور ثقافت بھی۔ اگرچہ یہ لوگ پاکستان میں شامل ہیں لیکن عام طور پر ثقافتی اعتبار سے ان کی آزادانہ حیثیت ہے۔

مالاکنڈ اور جہاد' لازم وملزوم

مالاکنڈ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں ہمیشہ سے' ہر دور میں' کسی نہ کسی صورت میں' جہاد جاری رہا ہے۔ یعنی یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ مالاکنڈ اور جہاد لازم وملزوم ہیں۔ تیرہویں صدی ہجری میں اس علاقہ میں جہاد فی سبیل اللہ کی عظیم تحریک اٹھی تھی جس کے بانی اُس صدی کے مجددِ اعظم سید احمد بریلوی غازیؒ تھے۔ آپؒ لکھنؤ سے بھی آگے رائے بریلی سے چلے تھے۔ چونکہ درمیان کا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں تھا' لہٰذا آپ کو پورا راجپوتانہ' پھر سندھ' پھر افغانستان عبور کر کے مالاکنڈ کے راستے NWFP میں داخل ہونا پڑا۔ اس لیے کہ درمیان میں پشاور کا علاقہ بھی انگریزوں کے زیر اثر تھا اور وہاں کے خان بھی انگریزوں کے زیرسایہ تھے۔

اس علاقے میں ان کا جہاد جاری رہا۔ خاص طور پر موجودہ بونیر اور شانگلہ کے علاقے ان کے بڑے مراکز رہے ہیں' جبکہ ان کی شہادت ضلع ہزارہ میں سکھوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کی تحریک جو بظاہر ناکام ہوئی' اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ جو مقامی خوانین ان کا ساتھ دے رہے تھے ان میں سے کچھ نے غداری کی' دوسرے خود ان سے بھی خطا سرزد ہوئی کہ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی جوش اور جذبہ میں شریعت نافذ کر دی' حالانکہ وہاں کے لوگوں کی ذہنی تیاری ابھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اپنے رواج اور روایات تھیں' ان سے ایک دم ہٹ جانا آسان نہیں ہوتا۔ ان کو چاہیے تھا کہ پہلے ان کو ذہنی طور پر تیار کرتے اور پھر تدریجاً شریعت نافذ کرتے۔ جیسے قرآن مجید میں شریعت کے احکام تدریجاً نازل ہوئے' مثلاً شراب ایک دم حرام نہیں کی گئی بلکہ ایک تدریجی

طریقے سے اس کو ختم کیا گیا۔

میرے خیال میں وہ کچھ اس مغالطے میں رہے کہ حضورﷺ جیسے ہی مدینہ تشریف لائے تھے' آپؐ نے فوراً وہاں شریعت نافذ کر دی تھی۔ جذبے کے تحت وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ حضورﷺ کو تو مدینہ والے خود آ کر لے گئے تھے اور وہاں آپؐ کے جانے سے پہلے آپؐ کے دو ساتھی مصعب بن عمیر اور عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہما نے دعوتِ قرآنی کے ذریعے فضا ہموار کر دی تھی۔ پھر جب آپؐ تشریف لائے تو آپؐ کا داخلہ ہی بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہوا اور آپؐ کا عظیم الشان استقبال ہوا۔ لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں تھا۔ سرحد کے پٹھان آپ کو نہیں لائے تھے' آپ تو خود آ گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے مہمان نوازی کی' آپ کا ساتھ دیا اور بہت تعاون کیا' لیکن پھر بعض معاملات میں ان کے رواج اس تحریک کے آڑے آ گئے اور ان کے اندر سختی آ گئی۔ پھر کچھ لوگوں نے بغاوت بھی کی اور اس علاقے کے لوگوں نے بڑی تعداد میں مجاہدین کو قتل بھی کیا۔

سید احمد بریلویؒ کے شہید ہو جانے کے بعد بھی اس جگہ پر جہاد جاری رہا اور انگریزوں کو یہاں قدم جمانے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ اس لیے انہوں نے چند قبائل آزاد چھوڑ دیے' کیونکہ یہ قبائل ان کے کنٹرول میں نہیں آ رہے تھے۔ موجودہ دور میں بھی ان قبائل کی حیثیت independent ہے اور آج بھی انہیں آزاد قبائل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے ان علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ان علاقوں میں بسنے والے قبائل کے ساتھ بڑے پُرکشش معاہدے بھی کیے مگر اس کے باوجود ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور بہت عرصے تک یہاں جنگ جاری رہی ہے۔ چنانچہ جہاد کا وہ دور شہادتِ بالاکوٹ کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ تحریک شہیدینؒ کے باقیاتِ صالحات کا سلسلہ بہت طویل عرصے تک جاری رہا ہے۔

مالاکنڈ کے سابقہ عدالتی نظام کی کیفیت

اب یہاں اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ سابقہ ادوار میں مالاکنڈ کے عدالتی نظام کی

کیا کیفیت تھی؟ سابقہ دور میں ان تینوں ریاستوں میں‘ بلکہ میرا غالب گمان ہے کہ باجوڑ کے حصوں میں بھی شرعی نظامِ عدل قائم تھا۔ یہ نظام تو بہاولپور‘ ٹانک‘ حیدرآباد دکن اور ہر مسلم ریاست میں تھا۔ وہاں نواب تھے لیکن قاضی القضاۃ بھی تھے۔ یہاں بھی ایک قاضی القضاۃ سوات میں‘ ایک دیر میں اور ایک چترال میں تھا‘ اور ان کے نیچے قاضیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ مقامی طور پر قاضی علماء تھے اور جید علماء قاضی القضاۃ کی حیثیت سے صدر مقام پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے ان کے ہاں عدل کا نظام بہت عمدہ تھا۔ اس نظام کی تین بڑی خوبیاں تھیں: (۱) وہیں کا وہیں معاملہ طے ہو جاتا (۲) انصاف بالکل مفت ملتا‘ کوئی فیس نہیں تھی (۳) دیوانی مقدمات زیادہ سے زیادہ دو تین مہینوں میں اور فوجداری مقدمات دو تین ہفتوں میں ختم ہو جاتے۔ ظاہر ہے جہاں کہیں بھی شرعی قوانین نافذ ہوں وہاں امن بھی ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ افغانستان میں طالبان نے شرعی سزائیں نافذ کیں اور وہاں امن ہو گیا‘ ظلم ختم ہو گیا۔ یہ برکات تو متفق علیہ ہیں کہ اگر اسلامی قوانین‘ خاص طور پر حدود و تعزیرات نافذ کر دی جائیں‘ تو جرم اور ظلم دونوں ختم ہو جائیں گے۔

تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدیؐ اور مولانا صوفی محمد

۱۹۹۴ء میں مالاکنڈ‘ سوات اور گرد و نواح میں ایک تحریک کا آغاز ہوا‘ جس کا نام تحریک نفاذِ شریعت محمدیؐ ہے۔ اس کا آغاز کرنے والے‘ اس کے روحِ رواں اور مرکز و محور مولانا صوفی محمد صاحب تھے۔ یہ اصل میں لوئر دیر کی تحصیل ’’میدان‘‘ کے رہنے والے ہیں۔ پوری طرح فارغ التحصیل اور مستند عالم ہیں یا نہیں‘ میرے علم میں نہیں ہے۔ لیکن بہرحال مذکورہ بالا علاقوں میں عالم کی حیثیت سے ان کا احترام ہوتا ہے۔ نہایت نیک‘ متقی‘ متدین‘ مخلص اور بہت ہی درویش منش انسان ہیں۔ لہٰذا عوام میں بہت محبوب اور مقبول ہیں۔ لوگ ان کا بہت ہی لحاظ کرتے ہیں‘ ان کی بات سنتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں۔ مگر مولانا صوفی محمد جدید تعلیم اور جدید فکر سے ناآشنا ہیں۔ وہ اس بارے میں ناواقف ہیں کہ جدید سیاسی‘ معاشی اور سماجی نظریات کیا ہیں‘ ان میں کیا غلط ہے اور ان کو

کیسے ختم کرنا ہے۔ موجودہ نظام کے بارے میں ان کا ذہن واضح نہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے اس میں کیا کچھ تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔

مولانا صوفی محمد ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے رکن رہے ہیں اور انہوں نے وہاں یونین کونسل کے الیکشن میں جماعت کے ٹکٹ پر حصہ بھی لیا' لیکن ناکام ہو گئے۔ اس کے بعد یہ جماعت کو چھوڑ گئے۔ یہ میرے اور ان کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ پھر یہ کہ صوفی صاحب کے نزدیک بھی انتخابات میں حصہ لینا ایسی مشق ہے جس کا کچھ حاصل نہیں۔ اس لیے کہ اسلام تو یہاں انقلاب سے آئے گا' انتخابات کے ذریعے انقلاب نہیں آ سکتا۔ لہٰذا یہ وقت کا ضیاع ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ میں بھی الیکشن کو اسلام کے نفاذ کا کوئی مفید ذریعہ نہیں سمجھتا اور یہ ثابت بھی ہو چکا ہے۔ پاکستان میں الیکشن کا سلسلہ ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا اور اب یہ ۲۰۰۸ء کا الیکشن ہوا ہے۔ ان کے نتیجے میں اسلام کو کیا ملا؟ اس کا حساب ہر انسان خود کر لے۔ بعد میں صوفی صاحب نے زیادہ سخت موقف اختیار کرتے ہوئے الیکشن سے متعلقہ تمام امور' الیکشن لڑنے بلکہ ووٹ ڈالنے پر بھی حرمت کا فتویٰ لگا دیا۔ بہرحال اس معاملے میں میرا موقف ان سے مختلف ہے اور میں ان کے اس موقف کی تائید نہیں کرتا۔ پھر میں نے انہیں خط لکھا کہ یہ ایک مسلمان ریاست ہے اور اس میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی ہے' جس میں یہ بات موجود ہے کہ حاکمِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہمارے پاس جو اختیارات ہیں وہ بطور امانت ہیں۔ جیسے ہم مسلمان ہیں اسی طرح ہماری حکومت بھی مسلمان ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ اسلام پر عمل نہیں ہے' لیکن عمل نہ ہونے سے کفر کا فتویٰ تو نہیں لگایا جا سکتا۔ اس پر انہوں نے میری تائید کی۔

تحریک نفاذِ شریعت محمدیؐ کا آغاز اور پہلا دور

سوات' چترال اور دیر کی ریاستیں' جب تک اپنی آزادانہ حیثیت پر برقرار تھیں تب تک ان کا عدالتی نظام شریعت اسلامی کے قوانین پر مبنی تھا اور وہاں امن و امان کی کیفیت تھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب یہ ریاستیں ختم ہو کر پاکستان میں ضم ہو گئیں اور ان کو پاکستان کا

حصہ بنا دیا گیا تو رفتہ رفتہ یہاں بھی شرعی نظامِ عدل ختم ہو گیا اور پاکستانی عدالتی نظام ان علاقوں میں نافذ کر دیا گیا۔اس عدالتی نظام میں مذکورہ بالا کوئی خوبی نہیں تھی ۔لہٰذا یہ لوگ جلد ہی اس نظام کے باغی ہو گئے اور پھر ۱۹۹۴ء میں یہاں سے مقامی لوگوں نے ایک عوامی مطلباتی تحریک کا آغاز کیا ۔ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارا سابقہ شرعی نظامِ عدل دوبارہ نافذ کیا جائے۔

مولانا صوفی محمد صاحب نے اس تحریک میں لوگوں کو بہت متحرک کیا۔لیکن یہ کوئی منظّم تحریک نہیں تھی' کوئی تنظیم نہیں تھی' کوئی جماعتی ڈھانچہ نہیں تھا' لوگوں کی تربیت نہیں تھی۔ جوش کے اندر یہ نعرہ لگایا گیا''شریعت یا شہادت''۔اس دعوے کے ساتھ وہ لوگ بڑے پیمانے پر جمع ہو گئے۔ چونکہ یہ کوئی منظّم تحریک نہیں تھی اس لیے وہاں تھوڑی گڑبڑ ہوئی ' کچھ لوگوں نے سیدو شریف کے ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی کچھ سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر کے اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔اس پر ملٹری پوری طرح مسلح ہو کر آئی اور وہاں بڑے پیمانے پر تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔پھر حکومت نے صوفی محمد صاحب سے مذاکرات کیے اور مذاکرات کا یہ دور کامیاب رہا۔حکومت نے وعدہ کیا کہ آپ کے مطالبے کے مطابق ہم یہاں پر شرعی نظامِ عدل نافذ کر دیں گے۔اس پر صوفی محمد صاحب نے اپنے لوگوں سے کہا کہ منتشر ہو جاؤ' ہمارا معاہدہ ہو گیا ہے۔مگر وہاں لوگوں نے پہاڑوں پر ڈیرے لگا دیے تھے۔لہٰذا مولانا صاحب کو سرکاری ہیلی کاپٹر دیا گیا۔اس کے ذریعے وہ پہاڑوں پر جا کر وہاں لوگوں سے کہتے تھے''چلے جاؤ' معاہدہ ہو گیا ہے''۔تو وہی بات کہ چونکہ کوئی نظم نہیں تھا' تربیت نہیں تھی' ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح واقفیت بھی نہیں تھی' لہٰذا بہت سے لوگوں نے تو فوراً بات مان لی' جبکہ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ مولوی بک گیا ہے۔ بہرحال مذاکرات اور حکومت کی طرف سے نظامِ عدلِ شرعی کے نفاذ کے وعدے کے سبب سب منتشر ہو گئے۔درحقیقت یہ اس تحریک کا پہلا دور تھا جو ۱۹۹۴ء میں ہوا۔

صوفی محمد صاحب سے میری ملاقاتیں

تحریک کے اس پہلے دور کے بعد مولانا صوفی محمد اور ان کی تحریک کا جب ہر جگہ

تذکرہ ہونے لگا تو اس پر مجھے ان سے ملاقات میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ جماعت اسلامی کے رکن رہے ہیں اور میں بھی جماعت کا رکن رہا ہوں' اور میری کچھ نفسیاتی کیفیت ہے کہ جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کبھی جماعت میں رہا ہے' تو مجھے اس سے ایک اُنس محسوس ہوتا ہے اور پھر میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح اسے اپنے رُخ پر لے کر آؤں اور اپنی اس دعوت اور فکر سے روشناس کراؤں۔ دوسری بات یہ کہ جب انہوں نے ایک اتنا بڑا اجتماع کر لیا اور بڑی کامیابی حاصل کی' تو اس کا میرے دل و دماغ پر بڑا اثر ہوا۔ میں ان سے ملاقات کے لیے دو دفعہ گیا۔ وہاں جب ان سے گفتگو ہوئی' تو تین باتیں میں نے ان سے کہیں:

(۱) آپ کہتے ہیں انتخابات حرام ہیں' تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اور آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ سیاسی اختلافات کو پرے رکھ کر دوسرے علماء سے بات کریں۔ انہیں دلیل سے قائل کر کے اپنی تحریک سے روشناس کرائیں۔ انہوں نے کہا نہیں' میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا' یہ میری رائے ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ میں نے اندازہ کیا کہ ان جیسے لوگوں کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

اس دور میں سب مٹ جائیں گے' ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ کا ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے!

اور میرے نزدیک بہت عرصے سے ایک اصول طے شدہ ہے کہ جو شخص جتنا مخلص ہو گا وہ اُتنا ضدی بھی ہو گا۔ اس لیے مولانا صاحب اپنی بات اور ہٹ کے پکے ہیں۔''

(۲) میں نے ان سے کہا کہ آپ پورے پاکستان میں شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں یا مالاکنڈ میں؟ مالاکنڈ کوئی ملک نہیں ہے' ملک تو پاکستان ہے۔ اگر آپ کو کوئی تحریک چلانی ہے تو پورے پاکستان کی سطح پر چلائیے' کیونکہ پاکستان اسی لیے تو بنایا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو اور شریعت اسلامی کا نفاذ ہو۔ میں نے یہ پیشکش بھی کی کہ میں لاہور میں ایک جلسے کا اہتمام کرتا ہوں اور آپ کو دعوت دیتا ہوں' آپ لاہور آئیے اور وہاں سے اپنی تحریک کا آغاز کیجیے۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں مالاکنڈ سے باہر نہیں جانا چاہتا۔

(۳) تیسری بات میں نے ان سے یہ کہی کہ کیا آپ لڑکیوں کو بھی وراثت میں حصہ دیں گے؟ آپ کے ہاں اس کا رواج ہے یا نہیں؟ کہنے لگے یہ تو ہمارے رواج میں نہیں۔ میں نے کہا کہ معاملہ رواج کا نہیں' شریعتِ اسلامی کا ہے۔ قرآن مجید میں تفصیل سے وراثت کے احکام آئے ہیں اور سورۃ النساء کا دوسرا رکوع وراثت کے احکام ہی پر مشتمل ہے۔ دوسری ملاقات میں جب میں نے پھر ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اب میں نے لوگوں سے بیعت لینی شروع کی ہے کہ ہم لڑکیوں کو بھی وراثت میں حصہ دیں گے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگرچہ صوفی صاحب ضدی تو ہیں' لیکن بات سننے اور غور کرنے کے لیے تیار ہیں' اور اگر کوئی بات ان کے دل کو لگے تو اسے قبول بھی کرتے ہیں۔''

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ مالاکنڈ کا معاملہ' طالبانِ افغانستان کی تحریک سے بالکل علیحدہ ہے۔ یہ تحریک تو ۱۹۸۸ء سے شروع ہوئی' کوئی آج کل کی بات تو نہیں ہے' جبکہ طالبانِ افغانستان کی تحریک تو بہت بعد کا معاملہ ہے۔ ۱۹۸۸ء سے یہاں پر جو معاملہ چل رہا تھا' وہ تحریک نفاذِ شریعت محمدیؐ کا تھا۔ یہ تحریک سوات سے اُٹھی اور بنیادی طور پر سوات کی تحریک کہلاتی ہے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے مالاکنڈ میں پھیل گئی۔ میرے خیال میں چترال میں اس کے اثرات نہیں ہیں' لیکن دیر اور باجوڑ میں اس کے گہرے اثرات ہیں۔ تحریک نفاذِ شریعتِ محمدی کا پہلا دَور میں نے آپ کو بتایا کہ ۱۹۹۴ء میں صوفی محمد صاحب نے بہت بڑا طاقت کا مظاہرہ کیا۔ اس میں سیدو شریف کے ایئرپورٹ پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور سرکاری عمارتوں پر بھی۔ پھر تحریک کے اس پہلے دور میں حکومت نے صوفی صاحب کے ساتھ مذاکرات کیے اور وعدہ کیا کہ ہم شرعی نظامِ عدل یہاں رائج کر دیں گے۔

تحریک کا دوسرا اور تیسرا دور

حکومت کی جانب سے وعدہ خلافی ہوئی۔ انہوں نے وعدہ پورا نہیں کیا تو لوگوں کے اندر ایک ردِّعمل اور غصہ پیدا ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں صوفی صاحب نے پھر تحریک اٹھائی۔

چک درہ کے میدان میں بہت بڑا اجتماع ہوا اور تقریباً ایک لاکھ افراد وہاں دھرنا دے کر بیٹھ گئے‘ کیونکہ مالاکنڈ سے آگے کا سارا علاقہ فوج نے گھیرا ہوا تھا اور مظاہرین کو آگے جانے سے روک دیا گیا تھا۔ پھر حکومت اور صوفی محمد کے درمیان دوسری بار مذاکرات ہوئے۔ دوبارہ عہد کیا گیا کہ ہم آپ کا مطالبہ مان لیں گے اور یہاں پر شرعی نظامِ عدل نافذ کر دیا جائے گا۔ لیکن پھر خلاف ورزی ہوئی۔

تحریک کے پہلے دور میں بے نظیر کی حکومت تھی اور دوسرے میں نواز شریف کی۔ اب تیسرا دور وہ آیا جس میں مشرف صاحب کی حکومت آ گئی۔ مشرف صاحب نے ۲۰۰۱ء میں صوفی صاحب کو قید کیا اور سات برس تک جیل میں رکھا۔ یعنی مولانا صوفی محمد ۲۰۰۱ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک اس مطالباتی تحریک کی پاداش میں قید میں رہے۔

تحریک کا چوتھا دور اور مسلح تحریک کا آغاز

صوفی محمد صاحب کے بعد اس تحریک کے اندر سب سے نمایاں آدمی ان کے اپنے داماد مولوی فضل اللہ تھے جو بہت جنگجو قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے اس مطالباتی تحریک کو ایک مسلح تحریک کی شکل دے دی اور یہ تحریک تین چار سال کے اندر جوان ہو گئی اور ایک مسلح قسم کی بغاوت (insurgency) کا آغاز ہو گیا۔ وہ جانتے تھے کہ ہم سے دو دفعہ وعدہ خلافی کی گئی ہے‘ لہٰذا جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلا تو اب ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑے گا۔ اس موقع پر پانچ عناصر اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

(۱) مولانا صوفی محمد کے قید ہونے سے قیادت نوجوانوں میں منتقل ہو گئی۔ اور نوجوان لوگ زیادہ تر ہوش کے بجائے جوش سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ مولوی فضل اللہ اور ان کے ساتھی مسلح ہو کر اس تحریک کو پُرجوش انداز میں چلانے لگ گئے۔ یعنی پہلی قسم کے لوگ اس تحریک کے ہی کارکن تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ اب وہ بزورِ بازو اپنا مطالبہ منوانا چاہتے تھے۔

(۲) بہت سے لوگ صوبہ سرحد کے علاقے سے افغانستان کے جہاد میں گئے ہوئے تھے۔ جب افغانستان میں امریکہ نے حملہ کر کے طالبان کی حکومت ختم کر دی

تو وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس آ گئے‘ مگر جہاد کا جو جذبہ ان میں پیدا ہو چکا تھا‘ وہ باقی تھا۔ ان کو نظر آیا کہ اب سیدو شریف‘ سوات اور مالاکنڈ میں جہاد ہو رہا ہے‘ تو وہ یہاں جہاد میں حصہ لینے آ گئے۔ میرے نزدیک پہلی قسم کے لوگ بھی مخلص تھے اور یہ لوگ بھی مخلص تھے۔

(۳) اس تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو افغانستان میں بیرونِ افغانستان سے جہاد کی غرض سے آئے تھے‘ مثلاً چیچنیا‘ ازبکستان‘ لیبیا‘ مصر‘ سعودی عرب وغیرہ سے آئے ہوئے تھے۔ جب افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم ہوئی تو لوکل طالبان اپنے اپنے قبیلوں میں چلے گئے‘ لیکن یہ کہاں جاتے یہ تو غیر ملکی تھے؟ پس یہ لوگ پاکستان آ گئے اور آزاد قبائلی علاقے وزیرستان اور باجوڑ کے علاقے (جو افغانستان کی سرحد سے بہت زیادہ متصل ہیں) میں آ کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے یہاں شادیاں بھی کر لیں‘ ان کے بچے بھی ہو گئے‘ اور یہاں پر وہ جہاد میں بھی حصہ لے رہے تھے۔ میرے نزدیک یہ غیر ملکی مجاہدین بھی مخلص تھے۔

(۴) ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو جرائم پیشہ تھے‘ اغواء برائے تاوان اور ہیروئن وغیرہ کی سمگلنگ کرتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے اوپر طالبان کا لبادہ اوڑھ لیا تاکہ پکڑ میں نہ آ سکیں‘ لوگ عام طور پر یہ سمجھیں کہ یہ طالبان ہیں‘ اس لیے ان کے ساتھ رعایت برتیں۔ اب انہوں نے ہتھیاروں کی سمگلنگ بھی شروع کر دی۔ یہ جو چوتھا عنصر اس تحریک میں شامل ہوا‘ یہ مخلص نہیں تھا بلکہ اس نے تحریک میں شامل ہو کر اپنے جرائم اور تیز کر دیے۔ اس طرح اس تحریک کی کافی بدنامی ہوئی۔

(۵) خادْ‘ را‘ موساد‘ نیٹو‘ روس کے ایجنٹ‘ یہ وہ پانچواں عنصر تھا جو اس تحریک میں بڑے پیمانے پر داخل ہوا اور ان کو افغانستان سے ہتھیار مل رہے تھے۔ بھارت کے جتنے بھی قونصلیٹ تھے‘ وہ ان لوگوں کو ہتھیار پہنچانے کا کام کر رہے تھے۔ پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ بھارت کے کئی کیمپ ہیں۔ وہ یہاں سے مقامی لوگوں کو ورغلا کر لے جاتے کہ تم لوگ پاکستان والوں سے لڑ رہے ہو اور پاکستان امریکہ کا آلہ کار ہے‘ تو ذرا تیار ہو جاؤ اور

پھران سے لڑنا۔ وہاں لے جا کران کی برین واشنگ کرتے‘ تربیت دیتے اور پھر یہاں بھیج دیتے۔

ان غیر ملکی ایجنٹوں کا مقصد پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنا تھا‘ کیونکہ جو آخری عالمی صلیبی جنگ افغانستان پر حملہ کے ساتھ شروع ہو چکی ہے‘اس جنگ کے اگلے مرحلے کو شروع کرنے سے پہلے ہمارے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کو destablize کر کے اس میں داخلے کا جواز پیدا کیا جائے کہ یہاں تو بدامنی اور فساد ہے‘ اور ہم یہاں امن قائم کرنے آئے ہیں‘ اور پھر یہاں آ کر پاکستان کے ایٹمی دانت توڑ دیے جائیں‘ تاکہ پاکستان بھارت کے رحم وکرم پر ہو جائے اور بھارت جیسا چاہے پاکستان کے ساتھ سلوک کرے۔ چاہے تو علیحدہ ملک کی حیثیت سے موجودہ حالت پر‘ اپنے تابع مہمل کی حیثیت سے برقرار رکھے اور چاہے تو پاکستان کو تقسیم کر کے پاکستان کے کئی حصے بنا دے۔

میں کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ کنڈ ولیزا رائس (جو بش کے زمانے میں امریکہ کی سیکریٹری آف سٹیٹ) بھارت اور پاکستان کا دورہ کر کے گئی تھی تو واشنگٹن میں جا کر اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ ہم اور بھارت مل کر کریں گے۔ کنڈ ولیزا رائس کا یہ قول پاکستان کے خلاف ہونے والی عالمی سازش (global conspiracy) کی طرف واضح اشارہ ہے کہ چند بیرونی طاقتیں (امریکہ‘ بھارت اور اسرائیل وغیرہ) مل کر پاکستان کو غیر مستحکم کر کے‘ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کو تلف کرنا چاہتی ہیں اور پاکستان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پاکستان نامی مملکت دنیا کے نقشے سے مٹانا چاہتی ہیں۔

تخریبی کارروائیاں کرنے والے کون؟

اس تحریک نفاذِ شریعت محمدی میں جب پانچ عناصر شامل ہو گئے‘ تو را‘ موساد اور خاد کے ایجنٹ یہ تخریبی کارروائیاں کرتے تھے کہ جا کر کسی مدرسے کو اڑا دیا‘ کسی سکول کو اڑا دیا‘ کسی کو ذبح کر کے اس کی لاش لٹکا دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اشتعال انگیزی شروع ہو‘ مقامی آبادی بھی مشتعل ہو اور پاکستانی فوج بھی آگے بڑھ کر کوئی اقدام کرے تاکہ

پاکستان میں تصادم کی فضا قائم ہو اور پاکستان destablize ہو جائے۔اس طرح ہمارے آقاؤں کوموقع اور جواز مل جائے اور وہ پاکستان میں داخل ہوکراس کے ایٹمی دانت توڑ دیں یااس کوٹکڑے ٹکڑے کردیں۔ یہ کام ان غیرملکی ایجنٹوں کا تھا جس کے لیے یہ ایجنٹ یہاں آئے تھے اوراصل تخریبی کارروائیاں اورخودکش حملے ان بدبختوں نے کیے ہیں۔اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بسااوقات جب ان میں سے کچھ پکڑے گئے تو وہاں کے مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ دیکھنے پرمعلوم ہوتا کہ ان کا تو ختنہ ہی نہیں ہوا‘ لہٰذا یہ مسلمان ہی نہیں ہیں۔

کسان تحریک

ایک بات اورنوٹ کیجیے کہ پاکستان بننے سے پہلے اس علاقے میں خوانین کے خلاف کسان تحریک چل رہی تھی۔سندھ کے وڈیروں کی طرح یہاں خان تھے۔آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک وڈیرے کی کتنی زمین اورکتنی رعیت ہوتی ہے‘اس کے اپنے پرائیویٹ جیل خانے ہوتے ہیں اوروہ لوگوں کوسزائیں دیتے ہیں جبکہ بے چارے ہاری کوتو بھوک سے ہی نجات نہیں ملتی تھی۔اُگاتا وہ ہے‘ہل وہ چلاتا ہے‘ فصل وہ کاٹتا ہے لیکن عیش وڈیرا کرتا ہے۔یہی حال خوانین سرحد کا تھا کہ کام سارا کسان کرتا تھا جبکہ خان عیش کرتا تھا۔تو یہاں کے کسانوں نے خوانین کے خلاف تحریک شروع کی اور ان خوانین کوقتل کرنا شروع کیا۔مگر جب روس کے ٹکڑے ہوگئے اوران کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہ رہا تو یہ تحریک بھی دب گئی۔ پھر۲۰۰۱ء میں جب اس علاقہ میں تحریک نفاذِ شریعتِ محمدیؐ ایک مسلح (militant) تحریک بن کراُبھری تو یہ کسان تحریک جودب گئی تھی‘ وہ پھرسراٹھانے لگی۔چنانچہ اس نے بڑے پیمانے پرخوانین کاقتل عام شروع کردیا۔اب اکثرخوانین یا تو مارے گئے یا وہاں سے بھاگ کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔اُن دنوں اسفندیار ولی بھی بھاگ کراسلام آباد آگئے تھے اور یہاں پناہ گزین ہوگئے تھے۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ تخریبی کارروائیاں یا تو را‘ موساد اور خاد کے ایجنٹوں نے کیں یا یہ کارروائیاں کسان تحریک والوں نے کیں۔جبکہ اس تحریک میں شامل ہونے

والے پہلے تین قسم کے گروہ ان تخریبی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ بلکہ وہ تو مخلص تھے اور خالص نفاذِ شریعت ان کا مطالبہ تھا' ان کا مقصد پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنا نہیں تھا۔

تحریک نفاذِ شریعت کا پانچواں دور اور صوفی محمد کی رہائی

جب صورتِ حال اس درجے تک پہنچ گئی اور حکومت کو خطرہ لاحق ہوا کہ اسے کنٹرول کرنا ان کے بس سے باہر ہے تو انہوں نے ۲۰۰۸ء میں صوفی محمد صاحب کو مجبوراً رہا کیا اور ان کے ساتھ تیسری بار مذاکرات ہوئے۔ لہٰذا اب پھر معاہدہ ہو گیا۔ اب یہ جو واقعات میں گنوانے چلا ہوں ان کو اچھی طرح نوٹ کیجیے تا کہ آپ فیصلہ کر سکیں کہ آرمی ایکشن جائز تھا یا نہیں!

پہلے حکومت سرحد کا صوفی محمد صاحب سے معاہدہ ہو گیا کہ ہم آپ کو دارالقضاۃ بھی قائم کر دیں گے اور قاضی کورٹس بھی' بس آپ کسی طرح ان طالبان کو روکیے۔ ۱۶ فروری ۲۰۰۹ء کو اس معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس پر امریکہ کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہوا' کیونکہ اگر یہاں امن قائم ہو جائے تو اس کا منصوبہ تو ختم ہو جائے گا۔ اسے تو اپنے ایجنڈے کی فکر ہے۔ چونکہ معاہدہ سرحد حکومت اور صوفی محمد صاحب کے درمیان تھا' لہٰذا جب تک اسے مرکزی حکومت تسلیم نہ کرتی اور صدر کی حیثیت سے زرداری صاحب اس معاہدہ پر دستخط نہ کرتے' اُس وقت تک یہ معاہدہ مؤثر (valid) نہیں تھا اس معاملے میں ایوانِ صدر کی طرف سے دو مہینے کی لیت ولعل اور تاخیر وتعویق سے کام لیا گیا۔ اس معاہدے پر نہ تو دستخط ہو رہے تھے اور نہ اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا جا رہا تھا۔ تاہم جیسے ہی معاہدہ ہوا' مکمل امن ہو گیا تھا۔ صرف دیر وادی کے اندر ایک کھلونا بم پھٹا تھا' جس سے گیارہ بچے جاں بحق ہو گئے۔ درحقیقت یہ طالبان کی کارروائی نہیں تھی' کیونکہ طالبان نے کبھی ایسے بم استعمال ہی نہیں کیے' یہ اصل میں روسیوں نے افغانستان کے اندر استعمال کیے تھے۔ تو وہاں سے کوئی اٹھا لایا ہو گا اور یہاں وہ پھٹ گیا' ورنہ طالبان کی طرف سے کچھ نہیں ہوا۔ جب دو ماہ گزر گئے اور معاہدہ پر کوئی پیش رفت نہ

ہوئی تو جوشیلے نوجوانوں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ آگے بڑھے‘ پہلے شانگلہ میں آئے اور اس کے بعد وہ بونیر میں بھی آ گئے۔ اس پر امریکہ اور ہمارے ذرائع ابلاغ نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ طالبان تو ایک دم اسلام آباد فتح کر لیں گے۔ اس لیے کہ شانگلہ کے بعد اسلام آباد کتنی دور ہے؟ شانگلہ تربیلا ڈیم کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ پاکستان کا صدر مقام اسلام آباد ہے۔

جب یہ کیفیت ہوئی تو سرحد حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے فوراً مرکزی حکومت کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر آپ اس معاہدے کو تسلیم نہیں کرتے تو ہم آپ کے اتحاد سے نکل جائیں گے۔ اس الٹی میٹم کا نتیجہ یہ نکلا کہ راتوں رات پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ زرداری صاحب نے براہِ راست دستخط نہیں کیے‘ کیونکہ وہ امریکہ کے سامنے یہ عذر رکھنا چاہتے تھے کہ پارلیمنٹ کا فیصلہ تھا‘ میں کیا کرتا۔ لہٰذا پہلے یہ معاہدہ پارلیمنٹ سے پاس کرایا اور پھر ۱۳/اپریل کو خود دستخط کیے۔ اس کے بعد صوفی محمد سے کہا گیا کہ بونیر میں جو پیش قدمی ہو چکی ہے اسے روکیے اور لوگوں کو وہاں سے واپس ہٹائیے۔ وہ گئے اور ان کی بات مان لی گئی۔ اکثر لوگ شانگلہ سے چلے گئے‘ تھوڑے بہت لوگ رہ گئے‘ لیکن اس کے بعد کوئی کارروائی وہاں نہیں ہوئی۔

صوفی محمد اور سرحد حکومت میں اختلافات

۱۶ فروری کو معاہدہ ہوا اور ۱۳/اپریل کو صدر صاحب کے دستخط ہوئے‘ اس دوران صوفی صاحب اور حکومتِ سرحد کے درمیان دو اختلافات بھی اُبھرے:

(ا) نفاذِ شریعت محمدی کے کارکنوں کا موقف یہ تھا کہ حکومتِ پاکستان نے دو مرتبہ ہم سے وعدہ کر کے خلاف ورزی کی ہے‘ لہٰذا اب ہم ان کے وعدے پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس لیے ہم ہتھیار نہ تو استعمال کریں گے اور نہ حکومت پاکستان کے حوالے کریں گے۔ یہ پہلے شرعی عدالتی نظام نافذ کر دیں‘ پھر ہم ہتھیار رکھ دیں گے۔ جبکہ مولوی فضل اللہ نے تو یہاں تک کہا کہ آپ اس نظامِ عدل کو قائم کر دیں‘ پھر ہم پاکستان کی فوج کے بغیر تنخواہ کے سپاہی بن جائیں گے اور جو تخریب کار ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور

ہمیں بدنام کرنے کے لیے ایسی کارروائیاں کر رہے ہیں‘ ہم انہیں پکڑ پکڑ کر آپ کے حوالے کریں گے۔ ہم اس وقت ان کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے‘ کیونکہ ہم تو حالتِ جنگ میں ہیں۔

(۲) دوسرا اختلاف یہ ہوا کہ شرعی کورٹس تو حکومت بنانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن اپیلیٹ کورٹ کے بارے میں کہا کہ وہ پاکستان کی سپریم کورٹ اور پشاور کی ہائی کورٹ ہوں گی۔ اس پر صوفی صاحب نے کہا کہ ہمیں یہ تسلیم نہیں ہے کہ جو فیصلے شریعت کورٹ میں علماء کریں‘ ان کے خلاف اپیل غیر علماء کے پاس جائے۔ اس لیے ہمارا دارالقضاۃ بھی ہونا چاہیے جس میں عوام کے معتمد علیہ اور جید علماء جج کی حیثیت سے موجود ہوں۔ اس کے لیے پشاور میں ہماری علیحدہ ہائی کورٹ بنا دیں یا موجودہ ہائی کورٹ کا ایک علیحدہ بنچ بنا دیں جو علماء پر مشتمل ہو اور شرعی عدالتوں کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل آئے تو اس کی سماعت کرے۔ یا ہماری دارالقضاۃ کے طور پر علیحدہ سپریم کورٹ بنا دیں‘ یا پھر سپریم کورٹ آف پاکستان میں علماء کا ایک بنچ بنا دیں جو ہماری شرعی عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت کرے۔ میرے نزدیک یہ دونوں باتیں صد فیصد درست تھیں۔

آرمی آپریشن کا آغاز

ابھی فریقین میں ان دو اختلافات کے بارے میں مذاکرات ہو رہے تھے کہ اچانک پارلیمنٹ اور کابینہ کی اجازت کے بغیر ۲۶/اپریل کو دیر میں‘ ۲۸/اپریل کو بونیر میں اور ۵‘۶ مئی کو سوات میں آرمی آپریشن شروع ہو گیا۔ نہ پارلیمنٹ کا فیصلہ آیا اور نہ کیبنٹ کا‘ تو اچانک آپریشن کیوں ہوا؟ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ زرداری صاحب کی برطانیہ اور واشنگٹن میں پیشی ہونے والی تھی‘ یعنی امریکہ اور برطانیہ کا دورہ تھا‘ اور ادھر امریکہ نے ایک نیا محاذ کھول دیا کہ امریکی حکومت کی طرف سے پاکستان کی سیاسی حکومت پر تنقید ہوئی کہ یہ کمزور ہے اور کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ ہاں پاکستان کی فوج مضبوط ہے اور وہ صحیح طور پر بات سمجھ گئی ہے۔ بھارت کے خلاف دشمنی وغیرہ کے جراثیم بھی اب اس میں ختم ہو رہے ہیں۔ گویا زرداری صاحب کو لال جھنڈی

دکھا دی گئی تھی کہ آپ اگر ہماری پالیسیوں کے مطابق نہیں چلتے تو آپ نہیں رہیں گے اورایک بار پھر پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہوجائے گا۔ آپ تو ویسے بھی ہمارے ذریعے این آر او (NRO) لے کر وہاں گئے ہیں اور آپ کو ہماری وجہ سے حکومت ملی ہے۔ لہٰذا امریکہ سے حکم آیا اور یہاں پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر آرمی ایکشن شروع ہوگیا۔

آرمی آپریشن کی کامیابی مستقل ہے یا عارضی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آرمی آپریشن کم از کم وقتی طور پر تو کامیاب ہوگیا ہے' اوراس کی ناکامی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک طرف پاکستان کی مسلح فوج تھی' جو ہر طرح کے جدید ہتھیاروں سے لیس تھی اور جسے ایئر فورس کی پوری طرح مدد حاصل تھی اور دوسری طرف یہ کارکن تھے' جن کے پاس چھوٹے ہتھیار تھے اور کوئی خاص اسلحہ نہیں تھا۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ پاکستانی فوج کو کامیابی ملے گی۔ اس لیے کہ مقابلہ بالکل غیر مساوی تھا' بلکہ مقابلے والی بات ہی نہیں تھی۔

کیا یہ آپریشن واقعتاً پوری طرح کامیاب ہو چکا ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے۔ حکومت کے اس دعویٰ کے باوجود کہ ہم نے بونیر' شانگلہ اور سوات کو بالکل کلیئر کر دیا ہے' مسلسل خبریں آ رہی ہیں کہ اتنی تعداد میں دہشت گرد مارے گئے' اتنی تعداد میں انہوں نے ہتھیار پھینک دیے' اتنی تعداد میں ان کو گرفتار کر کے ان کا اسلحہ برآمد کرلیا گیا۔ اگر وہاں سے کلیرنس ہوگئی ہے اور تحریک کی کمر ٹوٹ چکی ہے تو یہ کہاں سے آ رہے ہیں؟ ابھی بھی مزید گرفتاریاں ہو رہی ہیں' مزید مقابلے ہو رہے ہیں' جھڑپیں ہو رہی ہیں' سوات اور گرد و نواح کی چوکیوں پر حملہ بھی ہوا ہے۔ یہ سب تو اسی طرح ہو رہا ہے' تو کامیابی کہاں ہے؟ اصل میں یہ عارضی کامیابی ہے' جیسی برطانیہ کو افغانستان میں تین بار حاصل ہوئی۔ اُس نے افغانستان کو تین بار فتح کیا لیکن وہاں ٹھہر نہیں سکا۔ اس لیے کہ افغانستان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ افغانستان کو فتح کرنا تو آسان ہے مگر افغانیوں پر حکومت کرنا ناممکن ہے کیونکہ وہ غلام رہنے والی قوم ہی نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے افغانستان کے بارے میں دو شعر کہے ہیں: ؎

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغاں درآں پیکر دل است
از کشادِ او کشادِ آسیا
از فسادِ او فسادِ آسیا

''ایشیا مٹی اور پانی کا ایک پیکر ہے۔ (ظاہر ہے کہ زمین کے دو بڑے عناصر مٹی اور پانی ہی تو ہیں) اور یہ افغان ملت اس پیکر کے اندر دل کی مانند ہے۔ اگر افغانستان میں فساد ہوگا تو پورے ایشیا میں فساد ہوگا اور اگر وہاں پر امن ہوگا تو ہر جگہ امن ہو جائے گا۔''

یہ وہی اسلوب ہے جیسے حضورﷺ نے فرمایا:

''دیکھو' جسم کے اندر ایک جز و ایسا ہے' اگر یہ صحیح ہوگا تو سارا جسم صحیح ہو جائے گا اور اگر یہ خراب ہوگا تو سارا جسم خراب ہو جائے گا۔ آ گاہ رہو کہ یہ دل ہے!''

لہٰذا یہاں معاملہ وہی ہو رہا ہے جو مارگریٹ تھیچر کہہ گئی تھی' جب وہ پاکستان کے دورے پر آئی تھی۔ اس نے یہاں طورخم بارڈر پر تقریر کی تھی' جس میں ایک طرف افغانی اور دوسری طرف پاکستانی تھے۔ عین درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے تقریر کی اور کہا:

We have learnt our lesson and the Russians will also soon learn their lesson.

یعنی ہم نے اپنا سبق سیکھ لیا ہے کہ افغانستان پر حکومت کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم نے تین دفعہ فوج کشی کی' تینوں دفعہ ہمیں فتح ہوئی' لیکن ہم فتح کو برقرار نہیں رکھ سکے اور ہمیں اس علاقے کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ اس نے کہا کہ روسیوں کو بھی جلد ہی سبق حاصل ہو جائے گا (اُس وقت تک ابھی روسی افغانستان سے نہیں گئے تھے' بلکہ ان کی جنگ جاری تھی) برطانیہ کو چاہیے تھا کہ وہ امریکہ کو سمجھاتا' جب امریکہ نے افغانستان پر فوج کشی کا فیصلہ کیا تھا' کہ تم افغانستان میں فوج کشی نہ کرو' اس سے تم دلدل میں پھنس جاؤ گے اور تمہارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ اب واقعتاً ایسا ہو رہا ہے اور اب وہ افغان جنگ پاکستان میں منتقل کر رہے ہیں کہ جب تک یہاں سے فنڈامنٹلزم کی جڑیں نہیں کٹیں گی' افغانستان کے اندر

کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے پاکستان میں مدارس کا بہت بڑا جال ہے اور جو فکر اور جذبہ ہے وہ تو مستقل طور پر یہاں سے منتقل ہو رہا ہے۔ لہٰذا اب ان کی ساری توجہ پاکستان پر مرتکز ہے اور یہاں پر سفارت خانہ کا ہیڈ کوارٹر بن رہا ہے۔ ٹھیک کہا ہے مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے کہ اسلام آباد منی پینٹا گون بن گیا ہے۔ حالانکہ پہلے ہی ہمارے کئی ایئر پورٹ ان کے قبضے میں ہیں۔ ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ بن قاسم پورٹس پر ایک خاص قسم کی جیپیں اُتر رہی ہیں‘ جو خاص طور پر امریکہ نے عراق جنگ کے لیے تیار کی تھیں۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ اسلام آباد میں امریکیوں نے تیرہ سو مکان کرائے پر لے لیے ہیں اور پشاور کے اندر پورا پی سی ہوٹل لینے کے لیے تیاری ہو رہی ہے‘ جبکہ اب بھی دو تین فلورز پر ان کا قبضہ ہے۔ اس کے علاوہ پشاور اور ایبٹ آباد وغیرہ میں سینکڑوں مکانات امریکیوں نے کرائے پر لے لیے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ زیادہ کارروائیاں پشاور اور اس کے گرد ونواح میں ہو رہی ہیں جہاں امریکی تنظیم بلیک واٹر کے قبضے میں سینکڑوں مکانات ہیں۔

درحقیقت یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ امریکہ افغانستان کی جنگ اب پاکستان کے ذریعے جیتنا چاہتا ہے‘ ورنہ وہاں جیتنا ممکن نہیں ہے‘ بلکہ وہ تو مذاکرات کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر یہاں بھی مسئلہ یہی رہا تو مالاکنڈ بھی پاکستان میں چھوٹا سا افغانستان بن جائے گا۔ آرمی کو عارضی فتح تو ہوگئی ہے‘ اور بھی کچھ کامیابیاں مل جائیں گی‘ لیکن یہاں سے یہ جذبہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اب اس تحریک کے اندر کئی جذبے شامل ہو چکے ہیں۔ مذہبی جذبہ تو ہے ہی‘ جس کے بارے میں مصری دانشور علامہ شکیب ارسلان کے قول کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ اسلام کی نبضیں اگر پوری دنیا میں ڈوب جائیں تب بھی یہاں نہیں ڈوبیں گی۔ یہ جذبہ ہی تو ہے کہ اتنی جانیں دینے والے نجانے کہاں سے آ گئے؟ کتنا کچھ جھیلا‘ کتنا کچھ برداشت کیا‘ کس قدر ان کے شہر برباد ہوئے‘ لیکن انہوں نے سب کچھ بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیا ہے۔

اب اس میں انتقامی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ اس جنگی کارروائی میں

بے شمار معصوم شہری مارے گئے۔ ایسے ایسے واقعات اخبارات میں آئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ مثلاً ایک شخص اپنے خاندان کی سولہ سترہ خواتین کو ایک ہائی ایس ویگن میں بٹھا کر کہیں محفوظ جگہ پر جانے کے لیے نکلا تو سامنے سے ٹینک آ رہا تھا۔ ٹینک پر سوار فوجیوں نے اسے وارننگ دی، اُس شخص نے گاڑی روکی، باہر آ گیا، ہاتھ اوپر اُٹھا لیے اور کہا میں اپنے خاندان کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچانے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا تم کیوں نکلے، تمہیں معلوم نہیں کرفیو ہے؟ اس نے کہا مجھے تو نہیں پتا کہ کرفیو ہے۔ انہوں نے کہا ریڈیو نہیں سنتے؟ اس نے کہا میرے پاس ریڈیو نہیں ہے۔ ابھی باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ ٹینک سے گولہ مارا گیا اور وہ سب کے سب ختم ہو گئے۔ اس طرح معصوم لوگ جو مارے گئے، اب وہ انتقامی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ماضی قریب میں یہاں باجوڑ کے ایک مدرسے پر امریکیوں نے میزائل مارا تھا، اس میں اسّی بچے ہلاک ہوئے تھے۔ اب کیا اس کی وجہ سے جوش اور انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا؟ انہوں نے اس کا بدلہ اس طرح لیا تھا کہ درگئی میں ہماری فوج کے ایک کیمپ میں پریڈ ہو رہی تھی، وہاں پر دھماکہ ہوا اور اس دھماکے میں انہوں نے کتنے ہی لوگوں کو مار دیا۔ مزید برآں کئی دوسرے جذبات بھی اس کے اندر شامل ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسان تحریک واقعتاً دوبارہ زور پکڑ جائے اور خوانین کے خلاف سرگرمِ عمل ہو جائے۔ پھر یہ سب مل کر ایک انقلابی قوت بن جائیں اور کارروائیاں تیز کر دیں۔

اب یہ مسلسل جنگ ہے اور یہاں مستقل چھاؤنیاں بنانی پڑیں گی، جیسا کہ حکومت نے اعلان بھی کیا ہے کہ ہم چھاؤنیاں بنائیں گے۔ اس میں مسلسل جانی نقصان ہوگا، خون بہے گا، اور جتنا ہماری فوج کا جانی نقصان ہوگا اتنا ہم بھارت سے اور نیچے دبیں گے، ہماری بھارت کے مقابلے میں پوزیشن اور کمزور ہوگی۔ ہماری فوجیں یہاں پر قابض اور مصروف رہیں گی اور کس قدر ہمارے وسائل خرچ ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم مستقل طور پر امریکہ اور آئی ایم ایف کے در کے سوالی بن جائیں گے۔ وہ جو چاہیں گے ہم سے شرطیں منوائیں گے۔ جیسے کیری لوگر بل کا معاملہ ہے کہ ڈیڑھ ارب سالانہ امریکی

امداد پر کس قدر کڑی شرطیں لگا دی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ ایٹمی پالیسی سے متعلق کوئی بھی شخص اگر وہ ہم سے مانگیں تو دینا پڑے گا۔ گویا سب سے پہلا ٹارگٹ ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہے۔ اب یہ شرائط ماننی پڑیں گی‘ کیونکہ اگر آپ نہیں مانتے تو آپ کے لیے جینا مشکل ہو جائے گا۔ اور ہماری معاشی حالت یہ ہے کہ ہم دیوالیہ تو بس ہو ہی چکے ہیں اور اب ہم امریکہ کے رحم و کرم پر ہیں۔ ابھی فرینڈز آف پاکستان کے اجلاس میں ایک پیسہ بھی نہیں ملا‘ کیونکہ فرینڈز آف پاکستان سب کے سب امریکہ کی مٹھی میں ہیں۔ اس کا اشارہ ہو گا تو سب ہو جائے گا‘ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کو اور شکنجے میں کسا جائے تاکہ یہ ہر طرح ہماری بات مانے‘ ہماری پالیسیوں پر عمل کرے‘ بھارت کے سامنے سر جھکائے‘ اور اپنے ایٹمی ہتھیار ختم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ فرینڈز آف پاکستان کا اتنا بڑا اجلاس ہوا‘ لیکن پاکستان کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا گیا‘ جبکہ ہمارے صدر زرداری صاحب ایک سو بیس ملین کی بات کر رہے تھے۔

شرعی نظامِ عدل کے نفاذ کے ممکنہ نتائج

فرض کیجیے‘ اللہ نے توفیق دی ہوتی اور صحیح وقت میں نظامِ عدل وہاں قائم کر دیا جاتا تو اس میں کون سا کفر اور پاکستان سے کون سی بغاوت تھی؟ انہوں نے کوئی اور مطالبہ نہیں کیا‘ سوائے اس کے کہ ہمارا سابقہ نظامِ عدل دوبارہ نافذ کر دو‘ ہم تمہارے پولیس پرچوں اور عدالتوں سے باز آئے۔ اس لیے کہ یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ نامعلوم کتنے سو کلومیٹر طے کر کے اور کتنا خرچ کر کے ایک آدمی اپنے مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے آیا ہے۔ اب آپ کہیں کہ آج نہیں‘ دو مہینوں کے بعد آیئے۔ پھر وہاں رشوتیں‘ پولیس کی من مانیاں‘ انصاف میں تاخیر‘ الغرض بہت سی قباحتیں تھیں‘ جن سے وہ تنگ آ گئے تھے‘ کیونکہ وہ اس کے ہماری طرح عادی نہیں تھے۔ انہوں نے پاکستان سے علیحدہ ہونے کی کوئی تحریک نہیں چلائی‘ جیسی بلوچستان کی علیحدگی پسند تحریک ہے۔ انہوں نے تو بس شریعتِ محمدیؐ کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے‘ اور شریعت سے بھی کوئی پوری شریعت مراد نہیں‘ بس اتنا ہی کہ ان کے مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہو جائیں۔

اگر ان کا مطالبہ مان کر وہاں شرعی نظامِ عدل کا نفاذ کر دیا جاتا تو وہاں مکمل طور پر امن قائم ہو جاتا اور معاملہ ویسے ہی ہوتا جیسا معاملہ افغانستان میں ہوا کہ جس کو دیکھ کر پوری دنیا حیران رہ گئی۔ طالبان کی شرعی حکومت کے ذریعے پورے افغانستان کے اندر امن قائم ہو گیا' مکمل طور پر جرائم سے پاک سوسائٹی پیدا ہو گئی' ملا عمر کے ایک حکم سے پورے ملک کے اندر پوست کی کاشت زیرو ہو گئی۔ ہم بھی اللہ کی توفیق سے یہاں شرعی نظام نافذ کر لیتے اور امریکہ کے گھڑے کی مچھلی نہ بنتے' اُس کے در کے سوالی نہ ہوتے' ہم نے اس کو اپنا آقا اور ملجا و ماویٰ نہ سمجھا ہوتا تو آج یہاں یہ حالات نہ ہوتے۔ یہاں بھی آج امن ہوتا اور پاکستان اس افراتفری کے دور سے نہ گزر رہا ہوتا۔

ہم نے تو ہمیشہ سے امریکہ کو اپنا آقا تسلیم کر رکھا ہے۔ اُس نے ۱۹۶۲ء میں ہمیں حکم دیا تھا کہ کشمیر میں پیش قدمی نہ کرنا' جبکہ اُس وقت چین اور بھارت کی جنگ ہو رہی تھی اور بھارت کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ اُس وقت کشمیر خالی تھا اور ہم بڑی آسانی سے وہاں پر قبضہ کر سکتے تھے' لیکن ہمارے آقا نے کہا نہیں' اور ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ ہمارے پاس گولڈن چانس تھا جو ہم نے ضائع کیا۔ نظامِ عدل کے نفاذ میں بھی ہم نے امریکہ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھا۔ حالانکہ اگر یہاں سوات اور مالاکنڈ میں نظامِ عدل قائم ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ اس کی پھر ہم توسیع کر سکتے تھے' یعنی پہلے فاٹا (Federally Administrated Tribal Areas) اور پھر پاٹا (Provincially Administrated Tribal Area) میں نافذ ہوتا' پھر صوبہ سرحد میں نافذ ہو جاتا اور پھر کیوں نہ پاکستان بھر میں نافذ کر دیا جاتا! اس لیے کہ سب کو سستا اور جلدی انصاف چاہیے۔ یہ نہیں کہ ایک دیوانی مقدمہ جس کا باپ نے دعویٰ دائر کیا تھا اور وہ فوت ہو گیا' اس کا بیٹا بھی اس مقدمہ کی پیروی کرتے کرتے فوت ہو گیا' اب اس کا پوتا وہ مقدمہ لڑ رہا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جو ۱۹۶۵ء سے کراچی جیل میں پڑا ہوا تھا' جس کے خلاف کوئی مقدمہ تک درج نہیں تھا' وہ چند ماہ پہلے جب جیل سے نکلا تو نیم پاگل ہو چکا تھا۔ ہماری عدالتوں میں اور ہماری جیلوں میں جو کچھ ہوتا ہے' اس ظلم وستم کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ بہر حال

نظامِ عدل اگر نافذ ہو جاتا تو اس میں خیر و برکت تھی' اور سب سے بڑھ کر اس میں ایک طرح کی پیش قدمی تھی پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی' جو اصل میں ہمارا ہدف بھی ہے اور قیامِ پاکستان کا مقصد بھی کہ یہاں پر اسلامی نظام قائم کیا جائے اور عدالتی نظام بھی اسلام کا نافذ کیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا' حضورﷺ نے چودہ سو سال پہلے عرب میں قائم کیا اور خلافتِ راشدہ نے اس نظام کو پوری دنیا پر لاگو کر کے اسے تقویت بخشی۔

ابھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی اور اب بھی راستہ کھلا ہے' کیونکہ سرحد حکومت اب بھی کہہ رہی ہے کہ ہم نظامِ عدل قائم کریں گے۔ اگر اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے تو وہ جذبہ سلگے گا اور پاکستان ایک ناسور بن جائے گا۔ طالبان کی طرف سے یہ اعلان آ چکا ہے کہ اگر ہمارے اُوپر کوئی اور حملہ کیا گیا تو پھر ہم مزید خودکش بمبار بھیجیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی وہ مرے نہیں ہیں اور نہ ہی ابھی ان کے حوصلے ختم ہوئے ہیں۔

ان تمام باتوں کے برعکس ہماری حکومت جنوبی وزیرستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ سوات آپریشن کے بعد اب امریکہ نے نیا پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا ہے کہ تم نے سوات میں آپریشن کیا' حالانکہ سوات والوں کا تو افغانستان کے طالبان سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا' ہم تو چاہتے ہیں کہ جنوبی اور شمالی وزیرستان میں آرمی آپریشن کیا جائے' کیونکہ ان علاقوں میں افغانستان سے بھاگ کر آنے والے طالبان اور خاص طور پر غیر ملکی طالبان چھپے ہوئے ہیں' جو امریکہ سے بدلہ لینے کے لیے سازشیں کر رہے ہیں۔ اب ہماری حکومت کو چاہیے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے اور جلدی میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھالے کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔☆

تیسری اور آخری جنگ عظیم کی پیشین گوئیاں

پچھلی صدی کے عظیم مؤرخ و فلسفی ٹائن بی نے ۱۹۵۰ء میں اپنی کتاب

☆ واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۲۷ ستمبر کا ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ مخلصانہ اور درمندانہ اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی اور حکومت پاکستان نے جنوبی وزیرستان میں آرمی آپریشن شروع کر دیا۔ (مرتب)

The World and The War میں پیشین گوئی کی تھی کہ:

The real war in 21st century will not be fought between the Communists and Capitalists but it will be fought between the Christians and the Muslims.

اُس نے یہ بھی کہا تھا:

Communism will not be able to sustain itself.

اُس نے ۱۹۵۰ء میں یہ پیشین گوئی کی‘ جبکہ ابھی کمیونزم بہت طاقتور تھا اور بڑی تیزی سے جنگل کی آگ کی طرح بڑھ رہا تھا‘ اور آج کمیونزم تقریباً مٹ چکا ہے‘ یعنی اس کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوگئی۔ بہرحال وہ فلسفی تھا اور فلسفی پسِ منظر (behind the scene) بھی دیکھ لیتا ہے کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی دوسری پیشین گوئی یہ تھی کہ اکیسویں صدی میں جو آخری جنگ عظیم ہوگی وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوگی‘ حالانکہ اس سے پہلے جو دو عالمگیر جنگیں ہوئیں وہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہوئیں‘ دونوں طرف عیسائی ہی تھے‘ ایک طرف کیتھولک عیسائی تھے اور دوسری طرف پروٹسٹنٹ۔ جبکہ یہ آخری جنگ مذہب کی بنیاد پر ہوگی۔

اسی آخری جنگ کے متعلق مفکرِ اعظم و فلسفیِ اعظم محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیاں بھی موجود ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((ثُمَّ هُدْنَةٌ تَكُوْنُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ بَنِي الْاَصْفَرِ فَيَغْدِرُوْنَ فَيَاْتُوْنَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِيْنَ غَايَةً تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اثْنَا عَشَرَ اَلْفًا))(۱)

’’پھر تمہارے اور عیسائیوں کے درمیان ایک بہت بڑی خونریزی ہوگی‘ وہ تم سے سارے معاہدے توڑ دیں گے اور تم پر اسّی علَم لے کر حملہ آور ہوں گے اور ہر علَم کے نیچے بارہ ہزار فوج ہوگی‘‘۔

مسند احمد کی روایت میں بھی اسی طرح کے الفاظ موجود ہیں:

((وَتَكُوْنُ الْمَلَاحِمُ فَيَجْتَمِعُوْنَ اِلَيْكُمْ فَيَاْتُوْنَكُمْ فِيْ ثَمَانِيْنَ غَايَةً مَعَ كُلِّ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجزیة‘ باب ما یحذر من الغدر۔

غَایَۃٍ عَشْرَۃُ آلَافٍ))(۲)

''پھر جنگیں ہونگیں' وہ جمع ہو کر تمہاری طرف اسّی علمَ لے کر آئیں گے' ہر علم کے نیچے دس ہزار کا لشکر ہوگا''۔

پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ ان روایات میں عیسائیوں کا ذکر ہے' حالانکہ ہمارا اصل دشمن تو یہودی ہے اور حدیث میں یہودی کا ذکر نہیں ہے! اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہودی' عیسائی اور ہندو تینوں اتحادی ہیں۔ عیسائی سب سے آگے (on the front) ہے' یہودی پیچھے ہے' وہ پلاننگ اور سازش کرتا ہے' اور بھارت کا تو دیرینہ خواب ہے کہ پاکستان کو ختم کر کے اکھنڈ بھارت دوبارہ قائم کیا جائے' کیونکہ مسلمانوں نے ہماری بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ تو اب جو جنگ شروع ہوگئی ہے یہ تیسری عالمگیر جنگ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اب جو جنگ ہوگی وہ ایشیا میں ہوگی' کیونکہ ہم نے دو جنگیں یورپ میں لڑی ہیں' ان میں ہمارا بے تحاشا نقصان ہوا ہے اور چھ کروڑ انسان قتل ہوئے ہیں۔

امریکی عزائم اور چار نکاتی پروگرام

پچھلی صدی کے آخر میں یوایس ایس آر کی تحلیل ہوگئی اور امریکہ کو روئے ارضی کی واحد سپریم پاور کی پوزیشن حاصل ہوگئی۔ یہودی دانشور ہنری کسنجر (جو سیکریٹری آف سٹیٹ بھی رہا ہے) نے کہا تھا کہ اکیسویں صدی مکمل طور پر امریکہ کی صدی ہوگی۔ یہ وہ خواب ہے جو وہ دیکھ رہے ہیں۔ یوایس ایس آر کی تحلیل کے وقت سے وہاں کے تھنک ٹینکس اور تمام یونیورسٹیوں کے پروفیسرز غور و فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ اکیسویں صدی میں امریکہ کو اپنی یہ حیثیت کس طرح برقرار رکھنی ہے! ایسا نہ ہو کہ کوئی اور مدمقابل کھڑا ہو جائے اور امریکہ اپنی اس حیثیت کو کھو دے۔ کیونکہ یورپ بھی کچھ اُبھر رہا ہے' چین بھی مقابلے کی تیاری میں ہے اور روس ایک بار پھر پَر نکال رہا ہے۔

امریکہ کا اپنی اس سول سپریم پاور آن ارتھ کی پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے چار

(۱) مسند احمد' ح:۱۶۲۲۳۔ مسند الشامیین' حدیث ذی مخبر الحبشی رضی اللہ عنہ۔

نکاتی پروگرام ہے:

(۱) زمین کے وسائل پر قبضہ: وہ دنیا کے وسائل معدنیات' زراعت اور خاص طور پر تیل پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے' کیونکہ یہ مشین کی دنیا ہے اور مشین تیل سے چلتی ہے۔ ظاہر بات ہے زمین پر سب سے کمزور مسلمان ہیں' لہٰذا ان کے ممالک پر قبضہ کر کے وسائل پر قابو پا لینا ان کے پیش نظر ہے' جس پر ان کا کام جاری ہے۔ امریکہ کا عراق پر قبضہ تیل کی خاطر تھا' اور افغانستان پر فوج کشی کی ایک وجہ وسطی ایشیا کے تیل کے ذخائر تک رسائی ہے۔ نیویارک ٹائمز کی اطلاع کے مطابق ۲۰۰۵ء میں بش نے حکم دے دیا تھا کہ سعودی عرب' پاکستان اور شام پر بھی حملہ کر دیا جائے۔ وہ تو پینٹا گون آڑے آ گیا۔ اس کی طرف سے کہا گیا کہ ہماری فوجیں بہت سے علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس حالت میں ہمارے لیے کوئی نیا محاذِ جنگ کھولنا ممکن نہیں ہے۔ جبکہ بش نے تو کروسیڈ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ کروسیڈ اصل میں افغان روس جنگ میں شروع ہوا تھا' جس میں امریکہ نے روس سے بدلہ لینے کے لیے ڈالر اور ہتھیار فراہم کیے۔ اس کا اپنا تو ایک آدمی بھی نہیں مرا لیکن اُس نے روس کو ٹکڑے ٹکڑے کروا دیا۔ اس جنگ میں افغانوں نے اپنی جانیں دیں' دنیا بھر سے مخلص مسلمان آ کر لڑے اور ''جہاد'' کا غلغلہ سب سے زیادہ امریکہ نے بلند کیا۔

(۲) دجالی تہذیب کی پوری دنیا میں اشاعت: وہ دجالی تہذیب جسے یہودیوں نے جنم دیا تھا' اب تقریباً پوری دنیا پر چھا چکی ہے۔ اس تہذیب کی تین سطحیں (layers) ہیں:

(ا) خدا کو حاکمیت کی گدی سے اُتارنا۔ یعنی ''حاکمِ اعلیٰ اللہ کی ذات ہے'' کا تصور ختم کر کے خود حاکم اور قانون ساز کی حیثیت اختیار کرنا۔ دنیا کو یہ بھی باور کرانا کہ مذہب اور ریاست کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے' اس لیے کہ مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ب) سود اور جوئے پر مبنی کیپٹلزم کی بڑے پیمانے پر اشاعت۔ حدیث میں آتا ہے کہ سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں' جن میں سب سے کم تر اس کے برابر ہے کہ انسان اپنی ماں سے زنا کرے' جبکہ آج پوری اسلامی دنیا میں سودی بینکاری رواج پا چکی ہے' منشیات اور

جنسیات کے ذریعے کمائی کی جارہی ہے اور دوسرے ورکرز کی طرح اب ’’سیکس ورکرز‘‘ کی اصطلاح بھی عام ہوگئی ہے۔ (ج) بے حیائی اور بے شرمی پر مبنی معاشرتی نظام کو پوری دنیا میں رائج کرنا‘ تا کہ خاندانی نظام کا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جائے ۔ یہ خاندانی نظام اسلام کے معاشرتی نظام کا سب سے اہم جزو ہے۔ امریکہ اور یورپ میں خاندان کا ادارہ ختم ہو چکا ہے ۔ وہاں بہت ہی کم لوگ شادی کے جھنجٹ میں پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: we are not married, we are living together —— اور وہ شادی کیوں کریں؟ اس لیے کہ وہاں طلاق کا بہت سخت قانون ہے اور طلاق سے بیوی آدھی جائیداد کی مالک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح والدین Old Houses میں پڑے ہوئے ہیں اور آپ اپنی بالغ لڑکی سے اتنا نہیں پوچھ سکتے کہ تم کہاں سے آرہی ہو؟ بے حیائی پر مبنی اس معاشرتی نظام کو امریکہ ہر حال میں فروغ دینا چاہتا ہے۔ اوپر کی دو چیزیں تو عالم اسلام میں صد فی صد موجود ہیں‘ جبکہ تیسری چیز ابھی یہاں زیادہ فروغ نہیں پا سکی۔ ابھی ان کی بے حیائی اور بے شرمی پر مبنی تہذیب ہماری جڑوں تک نہیں پہنچی ہے۔ چنانچہ یو این او کے سوشل انجینئر نگ ورکس کے تحت فیصلہ ہوا ہے کہ عورت کی آزادی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

(۳) اسلام کو نظام کی حیثیت سے کہیں ابھرنے نہ دینا: امریکہ کے چار نکاتی پروگرام میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کو دنیا میں کہیں بھی نظام کے طور پر قائم نہ ہونے دیا جائے اور جہاں کہیں یہ اُبھرے‘ اسے اسی وقت ختم کر دیا جائے (Nip the evil in the bud!)۔ جب یو ایس ایس آر کی تحلیل ہوگئی تو نیٹو کی از سرِ نو تعمیر شروع کر دی گئی اور کئی نئے ممالک اس میں شامل کر لیے گئے ۔ کسی نے نیٹو چیف سے پوچھا کہ آپ کا دشمن تو اب ختم ہو گیا ہے‘ اب آپ نیٹو کی تعمیر کس لیے کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ اب ہمارا مقابلہ اسلام کے انتہا پسندوں سے ہوگا‘ اس لیے ہم نیٹو کو اور مضبوط کر رہے ہیں۔

(۴) صیہونیت اور Neo-cons کے پانچ نکاتی ایجنڈے کی تکمیل: وہ پانچ نکاتی ایجنڈا درج ذیل ہے۔

(i) آرمیگا ڈان (بہت بڑی جنگ): بائبل کا آخری باب ''مکاشفاتِ یوحنا'' ہے' جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری ''یوحنا'' کی پیشین گوئیاں ہیں۔ ان میں سے ایک پیشین گوئی یہ ہے کہ اس دنیا کے خاتمہ سے پہلے ایک بہت بڑی جنگ ہوگی۔ اُس نے جگہ کی نشاندہی بھی کی ہے کہ یہ جنگ وہاں ہوگی جہاں لبنان' فلسطین اور شام ملتے ہیں۔ اسی مقام پر ایک وادی ایفق ہے جو مسقط سے ''لد''(Lydda) جاتی ہے اور یہ اسرائیل کا سب سے بڑا ائیر بیس ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اسی مقامِ لُد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے۔ لفظ آرمیگا ڈان کے ڈکشنری میں یہ معنی دیے گئے ہیں:

A very big war which will be fought between the forces of good and evil before the end of this world.

رسول اللہ ﷺ نے اس جنگ کو اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی (عظیم ترین جنگ) کا نام دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ جنگ زیادہ دُور نہیں ہے۔

(ii) گریٹر اسرائیل کا قیام: حدیثِ نبویؐ کی رو سے اس آخری صلیبی جنگ میں تمام ممالک مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور عظیم تر اسرائیل قائم ہو جائے گا' جس کا نقشہ اس کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر آویزاں ہے۔ یہودیوں کے اس نقشے کے مطابق پورا فلسطین' پورا شام' عراق (کم از کم دجلہ تک)' مصر کا انتہائی زرخیز دریائے نیل کے ڈیلٹا کا علاقہ' ترکی کا جنوبی حصہ اور سعودی عرب کا بھی شمالی حصہ بشمول مدینہ' یہ سب گریٹر اسرائیل کا حصہ بنیں گے۔ یہ لوگ مکہ کو شامل نہیں کرتے مگر مدینہ کو کرتے ہیں۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ مدینہ میں داخلے کی کوشش ضرور کریں گے مگر اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں گے۔

(iii) مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو گرانا: صخرہ کے معنی چٹان کے ہیں۔ سفر معراج میں حضور ﷺ اس چٹان سے براق پر بیٹھے تھے اور یہاں سے اپنا آسمانی سفر شروع کیا تھا۔ تیرہ سو سال پہلے اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اس جگہ پر گنبد بنا دیا۔ تصاویر میں اور ٹی وی پر جو سنہرے رنگ کا گنبد دکھایا جاتا ہے' وہی قبۃ الصخرۃ (Dome of

the Rock) ہے۔

(iv) ہیکل سلیمانی کی تعمیر: مسجد اقصیٰ اور قبة الصخرة کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر ان کے اس ایجنڈے کا ناگزیر حصہ ہے۔ ہیکل سلیمانی کی تاریخ یہ ہے کہ اسے ایک ہزار سال قبل مسیح تعمیر کیا گیا' ۵۸٦ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے اسے تباہ و برباد کر دیا' تقریباً سو سال بعد اسے دوبارہ بنایا گیا' پھر ٹائٹس رومی نے ۷۰ء میں اسے دوبارہ گرا دیا۔ اُس وقت تک رومی عیسائی نہیں بلکہ بُت پرست تھے۔ یہ ہیکل سلیمانی اب تک گرا پڑا ہے۔ اس کی صرف ایک دیوار باقی ہے جسے دیوارِ گریہ (Wailing Wall) کہتے ہیں۔ یہودی وہاں جا کر ماتم کرتے ہیں۔

(v) عالمی حکومت کا قیام: ان کے منصوبے کے مطابق ہیکل سلیمانی (3rd Temple) کی تعمیر کر کے یہاں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت لا کر رکھا جائے گا۔ اس کی تفصیل Philadelphia Trumpet میں شائع ہوئی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی تاج پوشی ایک پتھر پر بٹھا کر کی گئی تھی' پھر اسی پتھر پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاج پوشی کی گئی اور اس کے بعد جتنے بھی یہودی بادشاہ ہوئے' ان سب کی تاج پوشی بھی اسی پتھر پر بٹھا کر کی جاتی رہی۔ جب ٹائٹس رومی نے ۷۰ء میں ہیکل سلیمانی کو گرایا اُس وقت یہ پتھر یروشلم میں موجود تھا۔ وہ یہودیوں کے اس مقدس پتھر کو اپنے ساتھ روم لے گیا' وہاں سے یہ آئر لینڈ' سکاٹ لینڈ سے ہوتا ہوا انگلینڈ آ گیا اور انگلینڈ کی پارلیمنٹ سے ملحقہ چرچ ''ویسٹ منسٹر ایبے'' میں اسے ایک کرسی میں نصب کر دیا گیا۔ اب انگلینڈ کے ہر بادشاہ کی تاج پوشی اسی مقدس پتھر والی کرسی پر بٹھا کر کی جاتی ہے۔ ان کے ایجنڈے کے مطابق ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد وہ پتھر یہاں لا کر رکھا جائے گا اور گلوبل حکومت قائم ہو جائے گی۔

یہاں تک تو عیسائیوں اور یہودیوں میں اتفاق ہے' اس سے آگے تھوڑا اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں ہمارے مسیحا حضرت عیسیٰ ؑ آئیں گے اور اس تخت پر بیٹھ کر حکومت کریں گے۔ جبکہ یہودی کہتے ہیں کہ ہمارا میسایاح (Messiah) آئے گا اور اس تخت

پر بیٹھ کر حکومت کرے گا۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ہونے کا مدعی یہ یہودی دجال ہوگا جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر قتل کریں گے اور اپنی حکومت کا اعلان کریں گے۔

ان کے نزدیک اس ہیکل کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو گرایا جائے اور انہیں پتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو عالمِ اسلام میں طوفان آ جائے گا' لوگ اُٹھ کھڑے ہوں گے اور یہ جو مسلمانوں کی حکومتیں امریکہ کی کٹھ پتلیاں اور ان کے گھڑے کی مچھلیاں ہیں' ساری کی ساری اس طوفان کی نذر ہو جائیں گی' اور پھر ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے ایٹمی دانت بنیاد پرستوں کے ہاتھ میں آ جائیں۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے پہلے پاکستان کے ایٹمی دانت توڑ دیے جائیں اور پھر گریٹر اسرائیل قائم کر کے ہیکل کی تعمیر کی جائے اور عالمی حکومت قائم کی جائے۔

آخری صلیبی جنگ کی تیاری

امریکہ روئے ارضی کی واحد سپریم پاور ہونے کے نشے میں چور پوری دنیا پر حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اس صلیبی جنگ کو شروع کیا جائے' جس کے لیے بہت زیادہ پیسے کی ضرورت تھی۔ امریکہ میں پیسہ تب ملتا ہے جب کانگریس اور سینٹ منظوری دیں۔ اب کانگریس کے ووٹ کے لیے ضروری تھا کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں بیدار کیا جائے۔ اس تمام صورتحال کے پیشِ نظر امریکہ کے تھنک ٹینکس سوچنے لگے کہ ''پرل ہاربر'' کی طرح کوئی بڑا واقعہ ہونا چاہیے جس کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا آغاز کیا جا سکے۔ اس پر ایک کتاب بھی لکھی گئی تھی: "America needs a Pearl Harbor" دوسری جنگِ عظیم میں یورپ جرمنی کے ہاتھوں پِٹ رہا تھا۔ اُس وقت یورپ کے اتحادی چاہتے تھے کہ کسی طرح امریکہ اس جنگ میں ہمارے ساتھ شامل ہو جائے تو پھر ہم یہ جنگ جیت جائیں گے' کیونکہ امریکہ کے پاس اتنی پاور ہے کہ وہ جرمنی کو شکست دے سکے۔ لیکن امریکہ اُس وقت تک جنگ میں کودنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس وقت یہ ہوا کہ جاپان نے امریکہ کی ایک بڑی بندرگاہ ''پرل ہاربر'' پر حملہ کیا جہاں امریکہ کا ایئر بیس بھی تھا' جس میں امریکہ کو بڑا نقصان اٹھانا

پڑا۔اس حملے کے سبب امریکہ اس جنگ میں کود پڑا اور اس طرح یورپ والوں کی جرمنی سے جان چھوٹی۔میرے خیال کے مطابق جاپانیوں سے یہ حملہ یہودیوں نے ہی کرایا ہوگا' کیونکہ ان کا سازشی نظام بہت مضبوط ہے۔اُس وقت بھی امریکہ کے تھنک ٹینکس غور کر رہے تھے کہ ایک بار پھر پرل ہاربر جیسا کوئی واقعہ ہوتا کہ رائے عامہ ہموار ہو اور ایوانِ نمائندگان سے ہر طرح کے اخراجات کی منظوری ملتی جائے۔ چنانچہ انہوں نے منصوبہ بندی کر کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے Twin Towers کو خود گرایا۔

میری اس بات کا ثبوت Philadelphia Trumpet کے اگست ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں شائع ہونے والا Gerald flurry کا مقالہ ''The Last Crusade'' ہے۔اس مقالے کی ایک عبارت ملاحظہ کیجیے:

"Many people think the crusades are a thing of the past- over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all!"

''بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگیں ماضی کی بات ہے اور ختم ہو چکی ہیں' لیکن ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں جاری ہیں اور یہ انتہائی خونی جنگ ہوگی''۔

یہ مقالہ اگست میں چھپا ہے تو جولائی میں لکھا گیا ہوگا' یعنی نائن الیون (۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء) کے واقعے سے پہلے لکھا گیا ہے۔معلوم ہوا کہ نائن الیون کا واقعہ ہی اس آخری عالمی جنگ کی سازش کی ابتدا ہے' جس کو بنیاد بنا کر افغانستان پر حملہ کیا گیا اور جس کی طرف اس جملے ''Preparations are being made'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح دس سال پہلے امریکہ میں ایک کتاب چھپی "Forcing God's Hands" یعنی انتہا پسند یہودی اور عیسائی کوشش کر رہے ہیں کہ کسی بھی طرح خدا سے زور زبردستی اس جنگ کو شروع کرایا جائے۔اس کے لیے انہوں نے یہاں تک کیا کہ سیاحوں کے روپ میں اسرائیل گئے اور بیت المقدس کے صحن تک سرنگ کھود لی۔اس کا

مقصد افراتفری پیدا کر کے مسلمانوں کے ساتھ آخری صلیبی جنگ کا آغاز کرنا تھا۔ یہ وہ تیاریاں تھیں جو غیر مسلم اس آخری صلیبی جنگ کے لیے کر رہے تھے۔

نائن الیون کے واقعہ کی اصل حقیقت

ان بدبختوں نے طاقت کے نشے میں چور ہو کر مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کرنے کے لیے یہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر خود گرایا اور سارا الزام اسامہ بن لادن اور القاعدہ پر لگا دیا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ یہ قائم کر دی کہ یہ سب القاعدہ کا کیا دھرا ہے اور یہ طالبان دہشت گردوں کے ساتھی ہیں' لہٰذا ان کو ختم کرنا بے حد ضروری ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حملہ القاعدہ نے کیا ہے وہ اس دنیا کے احمق ترین انسان ہیں۔ امریکن ایسوسی ایشن آف پائلٹس کے مطابق وہ لوگ جن کو چڑیا جیسے جہازوں پر ٹریننگ دی گئی تھی وہ اتنے بڑے جہازوں کو کنٹرول کر کے ٹھیک نشانے پر جا کر دے ماریں' یہ ناممکن ترین بات ہے۔ اور پھر یہ جہاز کہاں سے اغوا کر کے لائے گئے؟ امریکہ کی ائیر فورس اُس وقت کہاں تھی؟ خود ان کے انجینئرز کہتے ہیں کہ جہاز کے ٹکرانے سے ناممکن ہے کہ یہ ٹاور سیدھے زمین بوس ہو جائیں۔ لازماً ان بدبختوں نے خود ان کی بنیادوں میں بم رکھے تھے جن کے پھٹنے سے وہ عمارت زمین بوس ہوگئی' کیونکہ جب بنیاد ختم ہو جائے تو اوپر کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ تیسری بات یہ کہ پہلے کہا گیا کہ آٹھ ہزار لوگ مارے گئے ہیں کیونکہ یہاں آٹھ ہزار لوگ کام کرتے تھے اور پھر بعد میں یہ تعداد ۳۸۰۰ ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس دن پانچ ہزار یہودی ملازم چھٹی پر تھے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جب یہ ٹاور گر رہے تھے اس وقت یہودی ساتھ والی عمارت میں اِس کا جشن منا رہے تھے۔ آخری بات یہ ہے کہ اس واقعے کی تحقیقات کے نتیجے میں آج تک ایسا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا جس سے یہ بات ثابت ہو کہ یہ سب القاعدہ یا اسامہ بن لادن نے کیا ہے۔ ان تمام باتوں سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ سب ایک ڈرامہ تھا جو صرف اِس صلیبی جنگ کے لیے کیا گیا تھا۔

پرویز مشرف سے میری ملاقات

صدر پرویز مشرف نے ۱۶ستمبر۲۰۰۱ء کی صبح صحافیوں کی ایک کانفرنس بلائی تھی اور تیسرے پہر علماء اور مشائخ کی۔ اس کانفرنس میں میں نے ان سے صاف کہا کہ اگر آپ نے اس وقت افغانستان کے خلاف امریکہ کی مدد کی تو یہ عدل و انصاف کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی ہوگی' کیونکہ ابھی کوئی جرم ثابت نہیں ہوا ہے' نہ طالبان کا اور نہ اسامہ بن لادن کا' تو پھر سزا کیسی؟ دوسرے یہ کہ اگر آپ نے امریکہ کا ساتھ دیا تو ہماری غیرت کا جنازہ نکل جائے گا' کیونکہ ہم نے طالبان کی پشت پناہی کی تھی اور ان کو مدد دی تھی۔ آج بھی ان کے سفیر ملا ضعیف اس کانفرنس میں ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ اب اگر ہم صرف ایک دھمکی پر بتاشے کی طرح بیٹھ گئے تو پاکستان کی عزت و غیرت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ؏ ''حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے''۔ تیسری بات یہ کہ اگر آپ ایک مسلمان حکومت کے خلاف کافر حکومت کا ساتھ دیں گے تو یہ اللہ اور اللہ کے دین کے خلاف بغاوت ہوگی۔ چوتھی بات یہ کہ آپ بتا رہے ہیں کہ اس سے ہمیں بہت فائدے حاصل ہوں گے' کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا' ہمارے ایٹمی پروگرام کو حفاظت مل جائے گی' جبکہ یہ کچھ نہیں ہوگا' یہ تو صرف وقتی طور پر آپ کو سنہری چاند نظر آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پھر آپ کی باری بھی آ کر رہے گی' کیونکہ اس کے پیچھے یہودی ہیں۔

صلیبی جنگ کا آغاز

مذکورہ بالا پیشین گوئیوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آخری صلیبی جنگ کا آغاز ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔ کیونکہ یہودی اور عیسائی سمجھتے ہیں کہ we are living in end times جبکہ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ دنیا تب ختم ہوگی جب ''کالکی اَوتار'' آئیں گے۔ چند سال پہلے ان کے بڑے بڑے پنڈتوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ کالکی اوتار آ گئے ہیں اور وہ محمدﷺ ہیں۔ یعنی مانتے تو وہ ہیں لیکن وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسے یہودیوں کے بارے میں قرآن میں آتا ہے: ﴿یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ

اَبْنَاءَ ھُمْ﴾. ڈاکٹر ذاکر نائیک کھل کر بیان کر رہا ہے کہ تم جو کالکی اوتار کی صفات بتاتے ہو تو وہ سب کی سب محمدﷺ میں پائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی کتابیں بھی اس آخری جنگ کے متعلق حضورﷺ کے ارشادات سے بھری ہوئیں ہیں' مگر مسلمان ہیں کہ اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ الغرض تمام مذاہب اب اس بات کو مان رہے ہیں کہ we are living in the end times۔

افغان جنگ

امریکہ نے ان ٹاورز کے گرائے جانے کو سبب بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا۔ درحقیقت افغانستان پر حملہ کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہونے سے اسلام کی ایک شکل اور اسلامی سزاؤں (حدود وتعزیرات) کی برکات دنیا کے سامنے آ گئی تھیں۔ اس کی وجہ سے انہیں اندیشہ ہوا' جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کہا تھا: ع ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں! یعنی دنیا میں کسی جگہ پر شریعتِ محمدیؐ نافذ نہ ہوجائے' کیونکہ اس کی برکات سے ابلیس کے بنائے ہوئے دنیا کے باقی نظام ختم ہو جائیں گے۔ ملا عمر کے ایک حکم پر پوست کی کاشت زیرو ہوگئی۔ حالانکہ امریکہ نے اس سے پہلے اس پوست کی کاشت کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا' فنڈز دیے کہ اسے روکو' اس سے ہمارا نوجوان ضائع ہو رہا ہے' مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سنٹرل ایشیا کے تیل کے ذخائر تک پہنچنے کا راستہ ہموار کرنا مقصود تھا۔

امریکہ میں ۲۰۰۴ء میں شائع ہونے والی کتاب ''Confessions of an Economic Hit Man'' میں عظیم فلسفی ٹائن بی کا افغانستان کے بارے میں بھی ایک عجیب اقتباس ملا ہے۔ اُس نے لکھا ہے: ''افغانستان میں صحیح اسلامی تہذیب موجود ہے اور اسلامی تہذیب کا احیاء بھی وہیں سے ہوگا''۔ (یہ تحریر ۱۹۳۰ء کی ہے)

بہرحال یہ تیسری عالمگیر جنگ کی شروعات ہیں۔ افغانستان پر حملے کے لیے امریکہ نے نہ تو یو این او کی اجازت کی پروا کی' نہ اپنے یورپی اتحادیوں سے کوئی مشورہ کیا

لیکن اس کے باوجود اتنی بڑی کولیشن کیسے وجود میں آ گئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے معاملے میں یہ سب متحد ہیں کہ کسی بھی طرح اس کا راستہ روکنا ہے۔ اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جب اسلام آباد میں لال مسجد کا حادثہ ہوا تو روس' امریکہ' نیٹو' چین' الغرض سب نے پرویز مشرف کے اقدام کو سراہتے ہوئے انہیں مبارک باد دی۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ فنڈ امنٹلسٹ اسلام ختم ہو جائے' اس کا نام ونشان نہ رہے اور مسلمانوں میں بھی ہمارا ہی نظام فروغ پائے۔ ہاں مذہبی طور پر نمازیں پڑھنے اور مسجدیں بنانے پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یعنی پرائیویٹ حیثیت سے اپنے مذہب کو زندہ رکھو لیکن اسلام بحیثیت نظام انہیں کسی طرح بھی قبول نہیں۔

امریکہ اس زمانے کا فرعون بنا ہوا ہے۔ قرآن کریم میں فرعون کا ایک قول نقل ہوا ہے ﴿مَا اُرِیْکُمْ اِلَّا مَا اَرٰی﴾ یعنی فرعون اپنے درباریوں سے کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں وہی دکھاؤں گا جو میں دیکھ رہا ہوں۔ اسی طرح امریکہ کہہ رہا ہے کہ میں دنیا کو وہی دکھاؤں گا جو میں دیکھ رہا ہوں یا جو میں دکھانا چاہتا ہوں۔

عراق جنگ

افغانستان کے بعد امریکہ نے عراق پر بھی بغیر کسی سبب کے حملہ کر دیا۔ وہ خود مانتے ہیں کہ اس جنگ کا کوئی سبب نہیں تھا۔ عراق پر حملہ کرنے کی جہاں ایک وجہ کروسیڈ کا آغاز تھا وہاں اس کی دو وجوہات اور تھیں: (۱) تیل کے ذخائر پر قبضہ' جیسا کہ ہم نے شروع میں بتایا تھا کہ دنیا کے وسائل پر قبضہ ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ (۲) دوسرا سبب اس جنگ کا یہ تھا کہ وہ عراق اسرائیل کو دینا چاہتے تھے۔ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون نے بہت پہلے کہا تھا کہ عنقریب عراق پر ہماری حکومت ہو گی۔ امریکہ کا خیال تھا کہ ہماری فوجیں عراق میں داخل ہوں گی تو لوگ ہمیں ہار پہنائیں گے کہ ہمیں ایک ڈکٹیٹر سے نجات دلانے کے لیے آئے ہیں' مگر وہاں تو امریکہ کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ﴿وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ﴾ اب اگر امریکہ وہاں سے شکست کھا کے نکل بھی گیا تو وہاں شیعہ سنی کی جنگ چھڑ جائے گی۔

مالاکنڈ کی جنگ

مالاکنڈ میں جاری جنگ کے متعلق سب سے پہلا یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آیا یہ ہماری جنگ ہے یا ہم نے کسی کی جنگ اپنے سر لی ہوئی ہے؟ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں لوگ یہ سوچتے تھے کہ ہم امریکہ کے آلہ کار کیوں بن گئے‘ ہم اس کی جنگ کیوں لڑ رہے ہیں؟ لیکن بعد میں یہ سوچ تبدیل ہوگئی اور ہماری حکومت اور ذرائع ابلاغ کو اس اعتبار سے ایک بڑی فتح حاصل ہوئی کہ وہ ہماری رائے عامہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ یہ جنگ امریکہ کی نہیں‘ بلکہ یہ پاکستان کی اپنی دفاعی جنگ ہے۔ اتنے بڑے دھماکے اور خودکش حملے ہو رہے ہیں‘ ہمارا امن ختم ہوگیا ہے‘ اس کے ذمہ دار انتہا پسند ہیں‘ لہٰذا ان کے خلاف کارروائی ضروری ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب کارروائیاں را‘ موساد‘ خاد‘ روس اور نیٹو کے ایجنٹ کر رہے ہیں‘ جیسا کہ ہم نے پہلے تفصیل سے اس بات کو ثابت کیا ہے۔ مگر ٹیلی ویژن کے مذاکروں‘ اخبارات کے اداریوں اور کالم نگاروں کے کالموں کے ذریعے سے عوامی رائے تبدیل کر دی گئی ہے اور اب سب لوگ اس آرمی ایکشن کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ درحقیقت یہ امریکہ کا اشارہ تھا کہ ان طالبان سے معاہدہ نہ کرو بلکہ آپریشن کرو۔ اس اشارہ پر راتوں رات بغیر کسی سے مشورہ لیے‘ آپریشن راہِ راست شروع کر دیا گیا۔

مالاکنڈ کی جنگ بھی اسی کروسیڈ کا حصہ ہے جس کا تذکرہ بش نے افغان جنگ کے موقع پر کیا تھا۔ ان کی نظر میں پاکستان اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ بن سکتا تھا‘ جہاں علامہ اقبال جیسی شخصیات پیدا ہوئی ہیں‘ جن کے بارے میں رمزے مکڈونلڈ نے ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر کہا تھا A poet has destroyed our dreams of United India یعنی انڈیا کو ہم ایک ہی ملک کی حیثیت سے چھوڑ کے جانا چاہتے تھے مگر ایک شاعر نے ہمارا یہ خواب پورا نہیں ہونے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب جتنی یہاں مضبوط ہے‘ اُتنی عالم اسلام میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہاں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے‘ بارہ ہزار دیوبندی مکتب فکر کے مدارس ہیں‘ چھ ہزار

بریلوی مکتب فکر کے اور اتنی بڑی تبلیغی جماعت ہے۔ یہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے امریکہ پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔ وہ مالاکنڈ کی جنگ کو سبب بنا کر ہمارے ایٹمی پروگرام پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ ہم نے اپنے عوام کو یہ باور کرادیا ہے کہ یہ جنگ ہماری بقا کی جنگ ہے۔ اس کو کہتے ہیں ''جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے''۔ بقول اقبال: ؎

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

وزیرستان کی ممکنہ جنگ

شاہ محمود قریشی کا کہنا ہے کہ ہم امریکہ کے دباؤ کے تحت وزیرستان پر حملہ نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کو سوچنا پڑے گا کہ وزیرستان میں گھس گئے تو یہاں سے پاکستان کے لیے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ یہاں پہاڑ اور ٹیلے ہیں اور یہاں کے لوگ بھی جنگجو اور جفاکش ہیں۔ سوات کا معاملہ اور تھا' وہ قبائلی علاقے نہیں' بلکہ وہاں پر تو بہت اچھے اچھے شہر اور بڑی عمدہ آبادیاں ہیں۔ یہ سب تو ہم سوچیں گے لیکن امریکہ ہمیں آپریشن پر مجبور کرے گا' کیونکہ ہم نے اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر ڈال دیا ہے☆۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے آس لگا رکھی ہے کہ اُس سے ہمیں بہت کچھ مل جائے گا' لیکن ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ملا اور نہ ملے گا' جیسے مشرف کو کچھ نہیں ملا تھا۔

قرآنی آیات واحادیث نبویہؐ سے استشہاد

میں نے آغاز خطاب میں جن آیات کی تلاوت کی تھی ان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ قرآن حکیم میں تین دفعہ آیا ہے کہ محمد عربی ﷺ کی بعثت کا مقصد غلبۂ دینِ حق ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾
(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

☆ واضح رہے کہ یہ خطاب جنوبی وزیرستان میں آپریشن شروع ہونے سے پہلے کا ہے۔

رسول اللہﷺ کو بھیجا گیا پوری نوعِ انسانی کے لیے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ....(سبا:۲۸)

ان آیات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپؐ کا مقصدِ بعثت اسی وقت پورا ہوگا جب پوری دنیا پر اللہ کا دین قائم ہو جائے گا' اور یہ ہو کر رہے گا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ حضورﷺ کی بعثت کا مقصد پورا نہ ہو اور دنیا ختم ہو جائے۔

پھر میں نے رسول اکرمﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت آپ کو سنائی۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الۡاَرۡضَ فَرَاَیۡتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا' وَاِنَّ اُمَّتِیۡ سَیَبۡلُغُ مُلۡکُھَا مَا زُوِیَ لِیۡ مِنۡھَا)) (۳)

''اللہ نے میرے لیے ساری زمین کو لپیٹ دیا' یہاں تک کہ میں نے سارے مشرق دیکھ لیے اور سارے مغرب دیکھ لیے۔ اور سن لو میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں میں قائم ہو کر رہے گی جو مجھے اللہ نے اس زمین کو سکیڑ کر دکھا دیے''۔

اس کے بعد میں نے جو تین حدیثیں آپ کو سنائی تھیں ان میں خاص اشارہ ہے مشرق کی طرف۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((یَخۡرُجُ نَاسٌ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَیُوَطِّئُوۡنَ لِلۡمَھۡدِیِّ یَعۡنِیۡ سُلۡطَانَـہٗ))(۴)

''مشرقی ملک سے فوجیں نکلیں گی جو حضرت مہدی کی حکومت قائم کریں گی''۔

عرب کے مشرق میں افغانستان بھی ہے پاکستان بھی اور ویسے عرب کے مشرق میں ہندوستان بھی ہے' کوئی عجب نہیں اگر ہم ناکام ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ یہ مشن ہندوؤں کے حوالے کر دے' وہ ایمان لے آئیں۔ جیسا کہ ایک مرتبہ تاریخ میں ہو چکا ہے' تاتاریوں نے ایک کروڑ کے قریب مسلمان قتل کیے اور پھر تاتاری خود ہی اسلام لے آئے۔ بقول اقبال: ؎

(۳) صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' باب ھلاك ھذہ الامۃ بعضھم ببعض۔ وسنن الترمذی' کتاب الفتن' باب ما جاء فی سؤال النبی ثلاثا فی امتہ۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الفتن والملاحم۔ وسنن الترمذی' کتاب الفتن۔

(۳) سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب خروج المھدی۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اور کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہی ہاتھوں یہ سعادت پوری کرا دے ۔آج کل افغانستان اور پاکستان کو جمع کر کے ایک لفظ کہا جا رہا ہے ''ایف پاک''۔اوباما نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔اس پر اگرچہ پاکستان نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا ہے اور چین نے بھی۔چین پاکستان کو ایک علیحدہ ملک دیکھنا چاہتا ہے' اس لیے کہ پاکستان میں اس کی انوسٹمنٹ بہت زیادہ ہے۔ بہرحال ہمارے اعتبار سے شاید یہ اچھی بات ہو کہ افغانستان اور پاکستان ایک ہو جائیں۔پھر یہ ایک بڑی زبردست طاقت بن جائے گی' کیونکہ افغانستان میں افرادی قوت ہے اور پاکستان میں ٹیکنالوجی اور ایٹمی صلاحیت ہے۔اگر یہ دونوں ایک ہو جائیں تو ظاہر بات ہے پھر یہ اتنی ہیبت انگیز (formidable) طاقت بن جائے گی جس سے ٹکر لینا کسی کے لیے آسان نہ ہو گا۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَأْیَاتٌ سُوْدٌ لَا یَرُدُّھَا شَیْئٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ))(۵)

''خراسان سے سیاہ علم برآمد ہوں گے' کوئی طاقت ان کا رخ موڑ نہیں سکے گی' جب تک کہ وہ ایلیا میں نصب نہ کر دیے جائیں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بیت المقدس کا نام ایلیا تھا۔خراسان کے نام سے ایران کا ایک صوبہ بھی ہے' لیکن احادیث میں جس خراسان کا تذکرہ ہے اس میں مالاکنڈ بھی شامل ہے اور وسطی ایشیا کی ریاستیں بھی' جن کو ہم روسی ترکستان کہتے ہیں' یعنی ان علاقوں سے فوجیں چلیں گی جو جا کر یروشلم کے اندر جھنڈے گاڑیں گی۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا اور وہ دجال کو قتل کر دیں گے' اور یہودیوں کو بھی چن چن کر قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسائیت کے خاتمے کا اعلان کر دیں گے' اس لیے کہ عیسائیت تو کوئی مذہب ہی نہیں ہے۔وہ فرمائیں گے کہ میں تو صلیب چڑھا ہی نہیں' تم نے کیسے صلیب بنا

(۵) سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب ما جاء فی النھی عن سب الریاح۔

لی؟ اور میں نے تو کہیں سود حلال نہیں کیا تم نے کیسے حلال کر دیا؟ لہٰذا عیسائیت اسلام میں ضم ہو جائے گی اور یہودیت ختم ہو جائے گی۔ یعنی عیسائیت بطور مذہب ختم ہو جائے گی اور یہودی تمام کے تمام مارے جائیں گے۔ ان کا گریٹر اسرائیل 'گریٹر graveyard' بنے گا۔ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور ہو کر رہے گا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِیْ اَحْرَزَهُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ، عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَعِصَابَةٌ تَكُوْنُ مَعَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ))(٦)

''دو لشکر میری اُمت کے ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے (دنیا ہی میں) دوزخ سے نجات کا پروانہ دے دیا ہے۔ ایک وہ جو ہند پر حملہ آور ہوگا اور دوسرا وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر (یہودیوں اور دجال کے خلاف) جنگ کرے گا''۔

حرفِ آخر

حالات خواہ کیسے ہی ہوں' دو کام ہر حال میں ہمیں کرنے ہیں: اوّلاً دعوت اِلی القرآن۔ نوعِ انسانی کو قرآن کی طرف بلانا کہ قرآن پڑھو' قرآن سمجھو۔ اور یہ پڑھنا سمجھنا سب سے پہلے مسلمانوں پر لازم ہے۔ پھر اس کو پوری دنیا تک پھیلانا ہمارا فرض ہے۔ میں نے ۱۹۶۵ء میں لاہور سے دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک شروع کی اور اُس وقت سے لے کر اب تک میرا بنیادی کام یہی ہے۔ دروسِ قرآن کی محافل' قرآن کانفرنسیں' محاضراتِ قرآنی' قرآنی تربیت گاہیں' انجمن ہائے خدام القرآن' دورۂ ترجمۂ قرآن' قرآن اکیڈمیز' قرآن کالج' یہ سب اسی دعوت رجوع الی القرآن کی مختلف جہتیں ہیں۔ اس دعوت کو میں نے ہندوستان میں بھی پیش کیا ہے اور اسے وہاں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ پیس ٹی وی پر میرے جو دروسِ قرآن نشر ہو رہے ہیں یہ ممبئی میں ہوتے تھے' جن میں پندرہ ہزار سے زائد لوگ شریک ہوتے تھے۔ یہ محض اندازہ نہیں ہے' بلکہ دس ہزار کرسیاں مردوں کے لیے اور پانچ ہزار عورتوں کے لیے لگائی جاتی تھیں۔

(٦) سنن النسائی' کتاب الجہاد' باب غزوۃ الہند۔ ومسند احمد' ح:۲۱۳۶۲' کتاب باقی مسند الانصار۔

اگر ہم اسلام کی سربلندی میں ناکام ہو گئے تو کیا پتا اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو چن لے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں کہہ دیا گیا ہے: ﴿وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ﴾ (محمد:۳۸) ''اگر تم پیٹھ دکھا دو گے تو ہم کسی اور قوم کو لے آئیں گے''۔ تو کوئی عجب نہیں اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو یہ سعادت عطا فرما دے۔ بہرحال ہمیں ہر حال میں دعوت رجوع الی القرآن کا کام کرنا ہے۔

دوسرا کام حزب اللہ کی تیاری ہے۔ حزب اللہ ان لوگوں پر مشتمل ہو: (۱) جن کے دلوں میں یقین والا ایمان ہو' (۲) عمل کے اعتبار سے بھی اسلام پر پورا اُترتے ہوں' (۳) ان کے دل میں سوائے اللہ کی رضا کے حصول اور آخرت کی فلاح کے کوئی اور اُمنگ اور آرزو باقی نہ ہو' (۴) اللہ کے دین کے لیے اپنا تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہوں' (۵) کسی ایک شخص سے بیعت سمع و طاعت میں منسلک ہو جائیں۔ یہ پانچ اوصاف جن لوگوں میں ہوں گے وہ حزب اللہ ہے' اور فلاح تو بالآخر حزب اللہ کو ہی ملے گی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿٢٢﴾﴾ (المجادلة) تو یہ دوسرا کام بھی میں کر رہا ہوں۔ اس کے لیے میں نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے' لوگوں کو جمع کیا ہے' اپنی قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ اس کام میں کافی وقت صرف کیا ہے اور جب تک زندگی ہے ان شاء اللہ' کرتا رہوں گا۔

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین و المسلمات○○

تذکرہ و تبصرہ

میثاق کا دورِ جدید زیرِ ادارت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جولائی ۱۹۶۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ صفحاتِ ذیل میں اس دورِ جدید کے پہلے شمارے کا اداریہ نذرِ قارئین ہے۔

ایک طویل غیر حاضری کے بعد میثاق اپنے قدر دانوں کی خدمت میں پھر حاضر ہو رہا ہے۔ اس غیر حاضری پر مجھے بڑی ندامت ہے لیکن اس دوران میں حالات کچھ ایسے رہے کہ میں اپنے آپ کو بالکل مجبور سمجھتا ہوں۔ سب سے بڑی مشکل جس سے اس عرصے میں دوچار ہونا پڑا وہ یہ تھی کہ میثاق کے مینیجر صاحب اپنی تعلیم اور امتحان کے چکر میں پھنس گئے جس کے سبب سے ان کے لیے رسالے کے انتظامی امور کی دیکھ بھال ممکن نہیں رہی اور میں کوئی متبادل انتظام کرنے پر قادر نہ ہو سکا۔ عارضی انتظام کے تحت ایک مرتبہ رسالے کی کتابت کرائی گئی لیکن جب میں نے کاپیوں پر نظر ڈالی تو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس صورت میں پرچے کے شائع ہونے سے اس کا نہ شائع ہونا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ کتابت شدہ کاپیاں ضائع کر دی گئیں اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک پرچے کی اشاعت کا کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد انتظام نہ ہو جائے اُس وقت تک اس کی اشاعت ملتوی ہی رہے۔ اس فیصلے سے اگرچہ رسالے کے قدر دانوں کو بڑی تکلیف ہوئی اور ان کے مسلسل اور بکثرت شکایتی خطوط سے مجھے بھی برابر روحانی کوفت رہی ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ میں بھی اس کوفت کو برداشت کروں اور میثاق کے قدر دان بھی۔ اب میں نے بہت سوچ بچار کے بعد رسالے کو کلیتاً برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حوالہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سلمہٗ ایک ذہین' سرگرم' اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے نوجوان اہلِ قلم ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ نہ صرف رسالے کو پابندی کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے بلکہ میں ان کی محنت اور قابلیت سے یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ وہ صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے اس کے معیار کو اونچا کریں گے۔ دعا کیجیے کہ میری یہ توقع پوری ہو۔

رسالے کو ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر دینے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اب میرا کوئی تعلق اس کے ساتھ باقی نہیں رہے گا۔ اس کے انتظامی امور سے تو بے شک مجھے اب کوئی تعلق نہیں

ہو گا لیکن میرا قلمی تعاون برابر اس کو حاصل رہے گا۔ میری تفسیر —— تدبرقرآن —— کی قسطیں اس میں پابندی کے ساتھ نکلتی رہیں گی۔ دوسرے مذہبی، علمی اور سیاسی مسائل بھی، جن پر میں اظہارِ خیال ضروری سمجھوں گا میرے قلم سے اس میں زیر بحث آتے رہیں گے۔ رسالے کا مقصد اور اس کا نصب العین بھی وہی رہے گا جو اب تک رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابتدا سے نہ صرف اس کے قدر دانوں میں سے ہیں بلکہ برابر اس کے معاونوں میں سے رہے ہیں۔ جس مقصد کے لیے یہ پرچہ نکالا گیا تھا وہ جس طرح مجھے عزیز ہے اسی طرح انہیں بھی عزیز ہے۔ اس وجہ سے مقصد کے معاملے میں بھی کسی رجعت یا انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، بلکہ توقع یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اس میں ترقی ہوگی۔ جو رفقاء اب تک اپنے قلمی تعاون سے میرا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں وہ ان شاء اللہ بدستور ڈاکٹر صاحب کا بھی ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں یہ خوشخبری سنانے کی سعادت بھی حاصل کر رہا ہوں کہ میری تفسیر —— تدبر قرآن —— کی پہلی جلد کی کتابت شروع ہوگئی ہے۔ یہ جلد سورۂ فاتحہ، بقرہ اور آل عمران کی تفسیر پر مشتمل ہوگی۔ صفحات کا اندازہ کم وبیش ایک ہزار ہے۔ اپنے امکان کے حد تک کاتب اچھا تلاش کیا گیا ہے اور چھپائی آفسٹ کی ہوگی۔ توقع ہے کہ کتاب اچھی بھی چھپے گی اور جلد بھی۔ یہ خدمت بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں انجام پا رہی ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام تکمیل کو پہنچائے اور آگے کے کام کے لیے عزم وحوصلہ نصیب ہو۔

اب صحت جس قدر بھی اجازت دے میں اپنی ساری توجہ دو کاموں پر صرف کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تفسیر کی تکمیل، دوسرے چند ذہین نوجوانوں کی ایسی تربیت کہ خدمت قرآن کا یہ کام آئندہ بھی انہی خطوط پر جاری رہ سکے جن پر یہ شروع کیا گیا ہے۔ جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے میں اپنا لکھنے کا زیادہ تر وقت اسی پر صرف کر رہا ہوں اور ارادہ یہ ہے کہ یہی میری زندگی کا آخری کام ہوگا اور اپنی تمام تر کوشش میں اسی پر صرف کروں گا۔ دعا کیجیے کہ میرا یہ ارادہ پورا ہو۔ دوسرے مقصد کے لیے میں نے ایک حلقہ تدبرقرآن قائم کیا ہے جس میں چند رفیق میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ میں ان لوگوں کو اپنے استاذ —— مولانا فراہیؒ —— کے طریق فکر سے بھی آشنا کر رہا ہوں اور اپنا جو سرمایہ ہے وہ بھی ان کی طرف منتقل کر رہا ہوں۔ اگرچہ اس طرح کے ٹھوس کاموں کی طرف لوگوں کی توجہ اس زمانے میں بہت کم ہے لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ چند نوجوان بھی تیار ہوگئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

امین احسن اصلاحی

الحمد للّٰہ وکفٰی والصلوۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

جماعت اسلامی کی پالیسی پر اپنے تنقیدی بیان کی اشاعت کے بعد میں اس بات کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ ایک پرچہ ایسا ہونا چاہیے جو اسی دعوتِ تجدید و احیائے دین کا علمبردار ہو جسے لے کر جماعت اسلامی اٹھی تھی۔ اسی غرض سے ایک ماہنامے کے ڈیکلریشن کی درخواست بھی میں نے متعلقہ حکام کو دے دی تھی جو بفضلہٖ تعالیٰ منظوری کے جملہ مراحل طے کر چکی ہے۔ لیکن عین وقت پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے حکم دیا کہ کوئی نیا پرچہ نکالنے کے بجائے ''میثاق'' کو سنبھالو' چنانچہ مولانا کے حکم کی تعمیل میں مَیں آج قارئین میثاق کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔

''میثاق'' کی ادارت کی ذمہ داری کو میں کسی نئے پرچے کے مقابلے میں بہت بھاری محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''میثاق'' اپنا ایک ماضی رکھتا ہے اور اس کا ایک معیار متعین ہو چکا ہے' ادھر مجھے اپنی کم مائیگی اور ناتجربہ کاری کا شدید احساس ہے۔ میں اس ذمہ داری کو ہرگز قبول نہ کرتا اگر مولانا مجھے پختہ یقین نہ دلا دیتے کہ ان کا پورا تعاون ''میثاق'' کو حاصل رہے گا اور وہ اس کی سرپرستی حسب سابق فرماتے رہیں گے۔

جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے' مجھے ''میثاق'' کے حلقے میں اول روز سے شرکت کا شرف حاصل ہے اور جن مقاصد کے تحت اس پرچے کا اجراء ہوا تھا ان سے مجھے کلیتاً اتفاق ہے۔ لہٰذا ''میثاق'' کے اس دورِ جدید کے افتتاح کے موقع پر اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وہی تحریر من وعن شائع کر رہا ہوں جو آج سے سات سال قبل ''میثاق'' کے اجراء کے موقع پر پرچے کے مقاصد اور اس کی پالیسی کے خطوط کی تعیین کے لیے مولانا نے قلمبند فرمائی تھی۔ میری زیر ادارت ''میثاق'' ان شاء اللہ انہی مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے گا۔

میں آخر میں قارئین میثاق سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میرے دل و دماغ کو حق کی قبولیت اور زبان و قلم کو حق کے اظہار کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائے' آمین!

خاکسار **اسرار احمد**

’’میثاق‘‘
کا اِجراء کیوں؟

تحریر: مولانا امین احسن اصلاحی

میثاق کے بانی مدیر مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم ومغفور کی یہ قابل قدر تحریر اولاً میثاق کے پہلے شمارے (جون ۱۹۵۹ء) میں ’’تذکرہ وتبصرہ‘‘ کے عنوان کے تحت شائع ہوئی تھی۔

اس رسالے کا نام ’’میثاق‘‘ محض اتفاق سے نہیں رکھ لیا گیا ہے‘ بلکہ یہ نام سوچ سمجھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ نام بہت بڑی حد تک اس مقصد کو تعبیر کرتا ہے جو اس کے نکالنے سے پیشِ نظر ہے۔

لغت میں میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہوا کرتا ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ پورا کرنے کے لیے باندھا جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کا مفہوم اس سے بہت بلند ہے اور چونکہ وہی مفہوم اس نام میں ہمارے پیش نظر ہے اس وجہ سے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ قرآن نے اس قسم کے دو میثاقوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ان کی عقل و فطرت سے لیا ہے۔ اس میثاق کا ذکر سورۃ الاعراف میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚ شَهِدۡنَا ۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۷۲﴾﴾

’’اور یاد کرو جبکہ نکالا تمہارے ربّ نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی ذُرّیت کو اور ان کو خود ان کے اوپر گواہ بنایا‘ پوچھا: کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے اقرار کیا کہ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا ربّ ہے۔ یہ اس لیے ہوا تا کہ تم قیامت کے دن

یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس چیز سے بالکل بے خبر ہی رہے۔''

یہ خدا کی ربوبیت اور اس کی توحید کا میثاق ہے جو ہر انسان کی فطرت سے لیا گیا ہے اور اس پر ہماری عقل و فطرت گواہ ہے۔

دوسرا عہد و میثاق وہ ہے جو اسی میثاقِ فطرت کی بنیاد اور درحقیقت اسی کے تقاضوں اور مطالبات کو بروئے کار لانے کے لیے ہمارے رب نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے ہم سے لیا ہے۔ یہ میثاق حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ تک جتنے پیغمبر اور رسول آئے ہیں سب نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی اپنی اُمتوں سے لیا ہے۔ یہ میثاق اپنی فطرت کے لحاظ سے ہے ایک ہی میثاق' لیکن چونکہ اس کی تجدید بار بار اور مختلف زمانوں میں ہوئی ہے اس وجہ سے ظاہر میں اس کے اندر تعدّد پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے ان تمام میثاقوں کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ یہ میثاق اب اُمت محمد (ﷺ) سے لیا جا رہا ہے' تو اس اُمت کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس میثاق پر خود بھی قائم رہیں اور دوسروں کو بھی اس کے اندر شامل کرنے اور ان کو اس پر قائم رکھنے کے لیے برابر اس کی شہادت دیتے رہیں۔ قرآن' جو اس میثاق کی آخری اور مکمل دستاویز ہے' اس حقیقت کی یاد دہانی ان الفاظ میں کر رہا ہے:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ (المائدۃ)

''اور تم اس فضل کو یاد رکھو جو اللہ نے تم پر فرمایا اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا' جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور قبول کیا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو' بے شک اللہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔''

ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الحدید)

''اور اللہ نے تم سے میثاق لیا ہے اگر تم مؤمن ہو۔''

یہی میثاق ہے جو ان تمام حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہم نے تسلیم کیے ہیں۔ یہی میثاق ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے حدود دِکار کیا ہیں اور اگر

ہم ان کے پابند رہیں تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور اگر ہم ان کی خلاف ورزی کریں تو اس جرم کی سزا کیا دے گا۔ یہ عہد و میثاق یک طرفہ نہیں ہے بلکہ‘ جیسا کہ ہر عہد و میثاق کی فطرت ہوتی ہے‘ یہ دوطرفہ ہے۔ اگرچہ تمام کائنات کے خالق و مالک کی شان اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے بندوں اور غلاموں پر اگر کچھ حقوق و فرائض عائد کرے تو اس کے جواب میں خود اپنے اوپر بھی ان کے حقوق عائد کر لے اور اس چیز کو ایک معاہدہ اور میثاق کا درجہ دے دے‘ لیکن چونکہ اُس نے ہمیں اختیار کی نعمت عطا فرمائی ہے‘ اس وجہ سے اُس نے اس عہد و میثاق کو ہمارے اوپر یک طرفہ واجب نہیں کیا ہے بلکہ اپنے فضل و رحمت سے خود اپنے اوپر بھی اس میثاق کی ذمہ داری لی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ‌ۚ وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ﴿۴۰﴾﴾ (البقرۃ)

’’تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے‘ میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے‘ تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔‘‘

اسی میثاق پر ہمارے ربّ کے ساتھ ہمارے تمام تعلقات قائم ہیں۔ اگر ہم اس پر قائم رہیں تو ہم اپنے ربّ کی وفادار رعیت اور اس کے اطاعت شعار غلام ہیں اور اس کی طرف سے ہمارے لیے فوز و فلاح اور غلبہ و نصرت کا وعدہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿وَمَنۡ اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا﴿۱۰﴾﴾ (الفتح)

’’اور جو ان باتوں کو پورا کرے گا جن کے لیے اس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو اللہ اس کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔‘‘

اور اگر ہم اس عہد کو توڑ دیں تو ہم اس کے نافرمان اور باغی ہیں اور اس جرم کی پاداش میں اس کی طرف سے ہمارے لیے لعنت اور دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی ہے‘ ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ۙ اُولٰٓـئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ﴿۲۵﴾﴾

(الرعد)

’’اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوطی کے ساتھ باندھ چکنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان

کے لیے لعنت اور برا ٹھکانا ہے''۔

یہود کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً﴾ (المائدۃ:١٣)

''بوجہ اس کے کہ انہوں نے میثاق کو توڑا ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور ان کے دل سخت کر دیے۔''

نصاریٰ کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (المائدۃ:١٤)

''اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان کا میثاق لیا تو جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاددہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے' تو ہم نے ان کے اندر اس کی پاداش میں قیامت تک کے لیے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔''

یہ رسالہ اسی میثاق کی تذکیر و یاددہانی کے لیے جاری کیا گیا ہے اور اسی نسبت سے اس کا نام میثاق رکھا گیا ہے۔ جس طرح ہر باوفا اور ہر صداقت شعار کے لیے اس میثاق پر ہر طرح کے حالات کے اندر قائم رہنا ضروری ہے اسی طرح ہر صاحبِ علم اور ہر صاحبِ شعور کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو اس عہد و پیمان کی یاددہانی بھی کرتا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے اس میثاق پر قائم رہنے کا بھی عہد لیا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو اس سے آگاہ کرنے اور ان پر اس کی حجت تمام کرنے کا بھی عہد لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝﴾ (الاحزاب)

''اور یاد کرو' جبکہ ہم نے نبیوں سے میثاق لیا اور تم سے اور نوح سے' ابراہیم سے' موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے' سب سے میثاق لیا' اور لیا ہم نے ان سے مضبوط میثاق۔''

اسی طرح اہل کتاب کے علماء اور پیشواؤں سے یہ عہد لیا گیا کہ جس کتاب اور شریعت کی پابندی کا انہوں نے اقرار کیا ہے اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ خود بھی قائم رہیں اور اس کی دفعات اور اس کے مضمرات دوسروں پر بھی آشکارا کرتے رہیں۔ فرمایا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ......﴾ (آل عمران:١٨٧)

''اور یاد کرو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا میثاق لیا کہ تم اس کو اچھی طرح لوگوں کے لیے واضح کرتے رہو گے۔''

یہ رسالہ اس فرضِ عظیم کو بلا امتیازِ مذہب عام انسانوں کے اندر بھی ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے اندر بھی اس کو ادا کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں دائروں کے اندر ان کے فطری تقاضوں کے لحاظ سے اس کا طریق تذکیر و دعوت کسی قدر الگ الگ ہوگا۔

عام بنی نوع انسان کو یہ خدا کے میثاقِ ربوبیت کی بنیاد پر دعوت دے گا۔ اس میثاق کے اوپر گواہ، جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے، انسان کی عقل وفطرت ہے۔ اس وجہ سے عقل وفطرت اور آفاق و انفس کے اندر اس کی جو شہادتیں موجود ہیں ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے گی اور پھر زندگی کے اندر اس کے جو تقاضے ابھرنے چاہئیں ان کی نشاندہی کی جائے گی۔ جدید فلسفہ نے فکر و تحقیق کے ہر گوشے میں اگر ایک طرف حقیقت کو گم کر دینے والی بہت سی مزخرفات کا انبار لگا رکھا ہے تو دوسری طرف اس میں ایسے نشاناتِ راہ بھی پائے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس کی پیدا کی ہوئی بہت سی اُلجھنوں کو دُور بھی کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان کو اچھی طرح اُجاگر کیا جا سکے اور قرآنی حکمت کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اس رسالے میں جو مضامین شائع ہوں گے ان شاء اللہ وہ ان ذہنوں کے لیے تریاق کا کام دیں گے جو جدید فکر و فلسفہ سے متأثر یا مسموم ہیں اور جو ہر بات کو صرف عقل کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں۔

خاص مسلمانوں کے لیے اس رسالے کی دعوت ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ﴾ (المائدۃ: ۱) کی دعوت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کے واسطہ سے ہم نے اس کی جس آخری شریعت کی اطاعت اور پابندی کا عہد کیا ہے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس شریعت کی پابندی کرے۔ یہ شریعت ہمارے اور ہمارے ربّ کے درمیان ایک میثاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم ''سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا'' کہہ کر اس میثاق میں شامل ہوئے ہیں اور ہماری بندگی اور وفاشعاری کا تقاضا یہ ہے کہ اس میثاق کے مطالبات پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کریں۔ یہی میثاق درحقیقت وہ حبل اللہ ہے جو ہمیں خدا کے ساتھ جوڑتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں ان نعمتوں کا حق دار بناتی ہے جن کا خدا کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حبل اللہ ٹوٹ جائے تو پھر خدا سے ہمارا تعلق ہی سرے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمیں قومی اور اجتماعی حیثیت سے جینے کی کوئی مہلت ملتی ہے تو اس کی حیثیت بس

ایک مہلت کی ہے۔ یہ مہلت اس لیے نہیں ملتی کہ ہم عزت کے ساتھ جینے کے حق دار ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ سنت کے تحت محض اس لیے ملتی ہے کہ ڈوبنے کے لیے ہماری کشتی اچھی طرح بھر جائے۔ اس مہلت کے دوران میں اگر زندگی کے کسی گوشے میں چمک دمک کے کچھ آثار بھی نظر آئیں تو اس سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اس کی مثال مریض کے اس سنبھالے کی سی ہے جو وہ دم توڑنے سے پہلے لیا کرتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' کا اقرار کر کے خدا سے کوئی عہد و میثاق باندھا ہے تو ان لوگوں نے باندھا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے' اس عہد و میثاق کی ذمہ داری ان لوگوں پر کس طرح عائد ہوتی ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے؟ اس وسوسے سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک ہم اللہ کو اپنا ربّ' قرآن مجید کو اس کا صحیفۂ آسمانی' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس اُمت کا ہراول دستہ مانتے ہیں اس وقت تک ہم سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی ذمہ داری سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جس کا اقرار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اس اقرار کی ذمہ داری صحابہؓ نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کی اور پھر ان سے یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ ہر عہد کے اَخیار و صالحین نے اس ذمہ داری کو اپنے اسلاف کا سب سے زیادہ مقدس ورثہ سمجھا' اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے جو اقرارِ صالح اگلوں نے کیا تھا پچھلوں نے بھی اس کو اپنا اقرارِ صالح تسلیم کیا۔ اس لیے کہ اس اقرار کا انکار یا اس سے گریز و فرار ان کے لیے اس وقت تک ممکن ہی نہ تھا جب تک وہ اپنے ان اسلاف سے خدانخواستہ براءت کا اور اسلام سے اپنے قطع تعلق کا اعلان نہ کر دیں۔

ہم اگر ان مقدس اَسلاف ہی کے خلف ہیں اور اپنے اس ماضی سے بیزار نہیں ہو گئے ہیں تو سمع و طاعت کا جو اقرار ہمارے اسلاف نے کیا ہے وہ خود ہمارا بھی اقرار ہے اور ہم اپنی ناخلفی کا اعلان کیے بغیر اس اقرار کی ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کو کوئی مسلمان جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا' لیکن اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل حقیقتوں سے بھی کوئی صاحبِ نظر انکار نہیں کر سکتا۔

ہم میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ

ہمارے ربّ کے ساتھ ہمارا تعلق کسی میثاق کے تحت ہے اور اس میثاق کی ہر چیز لکھی ہوئی اور متعین ہے اور ہم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کے اقرار کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے۔ان لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ محض رسمی اور رواجی ہے' اور اگر وہ کسی حد تک اس کو نباہتے ہیں تو اسی حیثیت سے اس کو نباہتے ہیں' نہ اس کے اندر کوئی زندگی ہے نہ کوئی اثر۔

ہم میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس معاہدے کی بہت سی دفعات سے متعلق مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔ان میں سے بعض اپنے شبہات وشکوک کو برملا ظاہر بھی کرتے ہیں۔بعض ان کو ظاہر تو نہیں کرتے لیکن ان کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں' جس کے سبب سے وہ نفاق اور بے یقینی کے مریض بن کر رہ گئے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میثاق کی دفعات میں سے صرف انہی دفعات کو ماننا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہیں۔ان دفعات کو یہ نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف ہیں۔یہ ترک واختیار وہ من مانے طور پر یک طرفہ کر رہے ہیں' حالانکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو ان کے اور ان کے ربّ کے درمیان ہوا ہے جس میں کوئی ادنیٰ تغیر وتبدل بھی وہ خدا کی مرضی کے بغیر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔انہوں نے اس ردّ وقبول کے لیے کسوٹی تہذیب حاضر کو قرار دیا ہے' جو چیز اس کسوٹی پر پوری اتر جائے وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز اس پر پوری نہ اتر سکے وہ ناقابل التفات۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف قسم کی طفلانہ تاویلوں سے اس پورے میثاق کو ایک بازیچۂ اطفال بنائے دے رہے ہیں اور اس کی ہر دفعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر مقصد تو درحقیقت پورے میثاق کا انکار ہے لیکن کھلم کھلا انکار کے بجائے انہوں نے تاویلِ باطل کی راہ اختیار کی ہے۔

بعض لوگوں نے سرے سے اُس ذات ہی کو مجروح کرنا شروع کر دیا ہے جو اس میثاق کا اصل واسطہ ہے اور جس نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے ہم سے یہ میثاق لیا ہے۔ان لوگوں کے نزدیک اس میثاق کا وہ سارا ریکارڈ مشتبہ ہے جو اُس ذات کے قول وفعل سے متعلق ہے۔

بعض لوگوں نے حکمتِ عملی یا عملی سیاست کے نام سے اس میثاق کی قطع وبرید کے لیے دین میں ایک نئے اصولِ ردّ وقبول کا اضافہ کیا ہے۔ان کے نزدیک عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت اس میثاق کی ہر دفعہ کالعدم کی جاسکتی ہے۔

یہ رسالہ مذکورہ بالا سارے گروہوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گا اوران شاءاللہ ہر باب میں اس کا اندازِ بحث علمی اور تحقیقی ہوگا۔اس میں نقل کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی وہ اہمیت دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے تاکہ وہ لوگ بھی ان مباحث سے پورا پورا فائدہ اٹھاسکیں جو جدید نظریات کے شعبدوں سے متأثر ہیں۔اس طرح کے لوگ ان شاءاللہ اس رسالہ کے ہر نمبر میں اپنے لیے نہایت روح پرور اور صحت بخش غذا پائیں گے۔ ہمارے کالجوں میں بھی اور دینی مدرسوں میں بھی ایسے بہت سے ذی صلاحیت اور ذہین لوگ موجود ہیں جو خدا کی شریعت کو ان پہلوؤں سے سمجھنا چاہتے ہیں جن پہلوؤں سے موجودہ عہد میں اس کو سمجھنا ضروری ہے‘ لیکن وہ اپنی اس تشنگی کو دور کرنے کا کہیں سامان نہیں پا رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ رسالہ کے اس باب کے مضامین ان کے لیے اچھا فکری مواد فراہم کریں گے۔

اب میں دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور اس رسالہ کے تمام قارئین سے اس دُعا پر آمین کہنے کی درخواست کرتا ہوں۔اے ربّ! تیرے چند عاجز بندوں نے تیرے دین کی ایک حقیر سی خدمت انجام دینے کے لیے یہ کام شروع کیا ہے۔اے ربّ! تو اس کام کو قبول فرمانے والا‘ سننے والا اور جاننے والا ہے۔اے ربّ! ہم تیرے ساتھ اپنے عہد کو تازہ کرنے کا عزم رکھتے ہیں‘ تو اس عزم میں ہماری مدد فرما اور اے ربّ! ہمیں توفیق دے کہ ہم تیرے دوسرے بندوں کے اندر بھی اس عزم کی گرمی پیدا کرسکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلَ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

۞۞۞

یہ نصف صدی کا قصہ ہے!

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا میثاق کے لیے خصوصی انٹرویو

انٹرویو: وسیم احمد

سوال: ماہنامہ میثاق کا ڈیکلریشن تو ابتدائی طور پر مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے حاصل کیا تھا' یہ شمع آپ کے ہاتھ میں کیسے آئی؟

جواب: ڈیکلریشن تو تھا مولانا محی الدین سلفی کے نام پر۔ جماعت اسلامی سے جو لوگ علیحدہ ہوئے تھے ۵۸۔۱۹۵۷ء میں' یہ انہی میں سے ایک تھے اور انہوں نے رسالے کا ڈیکلریشن اصلاحی صاحب کی ایماء پر حاصل کیا تھا۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اسے چلایا لیکن وسائل کی کمی کے باعث اس کو جاری نہ رکھ سکے۔ مولانا اصلاحی صاحب اپنی جگہ بہت بڑے عالم اور مفسر قرآن تھے لیکن ان کا کوئی علیحدہ حلقہ نہیں تھا' وہ جماعت اسلامی کے ساتھ سترہ برس وابستہ رہے اور وہی ان کا اصل حلقہ تعارف تھا' لیکن جماعت سے علیحدگی کے بعد چونکہ انہوں نے کچھ مخالفانہ بیان بھی دیے تو جماعت نے بھی ان کی کتابوں اور ان کے رسالے کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پرچہ کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔

میں جب ۱۹۶۵ء میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تو پرچہ بند پڑا تھا' کئی مہینوں سے چھپا ہی نہیں تھا' اس کے اوپر قرضہ بھی تھا لوگوں کا۔ میں نے جب اپنی کتاب ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' شائع کی جس میں جماعت اسلامی سے اپنا اختلاف تفصیل سے بیان کیا تو اس پر پھر اخبارات وجرائد میں تبصرے شائع ہوئے۔ اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان تبصروں کا جواب دیا جائے۔ اس کے لیے مجھے ایک ماہانہ رسالے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ چنانچہ میں نے ماہنامہ ''الرسالہ'' کے نام سے ایک ڈیکلریشن لے لیا۔ جب مولانا اصلاحی صاحب کے علم میں آیا کہ میں نے نئے پرچے کے لیے ڈیکلریشن لے لیا ہے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ نیا پرچہ کیوں نکالتے ہو؟ یہ میثاق ہے' اسے میں نے شروع کیا تھا' اسی کو تم لے لو اور

چلاؤ‘اس کا نام زندہ رہے گا تو میری تسکین ہوگی کہ میں نے یہ پرچہ جاری کیا تھا۔ چنانچہ میں نے ’’الرسالہ‘‘ جاری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور میثاق شروع کر دیا۔ اس کے ذمے لوگوں کے جو بھی واجبات تھے وہ بھی بفضلہٖ تعالیٰ میں نے ادا کیے۔ مثلاً مولانا وحید الدین خان صاحب کا دہلی سے بڑا تلخ خط آیا تھا‘ ان کے بھی پیسے ادارۂ میثاق کے ذمے واجب الادا تھے لیکن ادائیگی کی کوئی شکل نہیں بن رہی تھی‘ میں نے وہ بھی ادا کر دیے۔ اس طرح سے وہ پرچہ میرے پاس آیا۔ یہ بھی نوٹ کرلیں کہ وحیدالدین خان صاحب یہاں آئے تھے‘ میں نے جب انھیں بتایا کہ میں نے ’’الرسالہ‘‘ کے نام سے ڈیکلریشن لیا تھا تو وہ اُس وقت تو خاموش رہے‘ کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کیا‘ اور انڈیا واپس جا کر ’’الرسالہ‘‘ کے نام سے ڈیکلریشن لے کر پرچہ جاری کیا جو آج بھی شائع ہو رہا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے میثاق کے اجراء کا مقصد بیان فرمایا کہ آپ کی کتاب پر تبصرے آ رہے تھے‘ اس کا جواب دینے کے لیے آپ نے ایک رسالے کی ضرورت محسوس کی۔ انجمن خدام القرآن یا تنظیم اسلامی کے قیام سے قبل اس کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی پیش نظر تھا یا صرف یہی تھا؟

جواب: یقیناً تھا‘ لازماً تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں جب ۱۹۶۵ء میں منٹگمری (ساہیوال) سے لاہور منتقل ہوا تو اس ارادے کے ساتھ آیا کہ میں نے ایک تحریک کا آغاز کرنا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوا تو اُس وقت میری عمر صرف ۲۵ برس تھی‘ اور مجھے اُمید تھی کہ یہ بزرگ حضرات یعنی مولانا امین احسن اصلاحی‘ مولانا عبدالغفار حسن‘ حکیم عبدالرحیم اشرف‘ شیخ سلطان احمد اور مولانا عبدالجبار غازی‘ جو بڑے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے‘ کوئی جماعت بنائیں گے۔ چنانچہ میں بھی ان حضرات کے ساتھ لگا رہا اور کبھی لائل پور (فیصل آباد)‘ کبھی رحیم یار خان اور کبھی صادق آباد ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ صادق آباد میں ۵‘۶ ارکان تھے جو جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے‘ رحیم یار خان میں بھی کئی تھے‘ لیکن یہ لوگ جماعت نہیں بنا سکے۔ بعد میں بالآخر میں نے طے کیا کہ اب میں اپنے طور پر اس تحریک کا آغاز کروں۔ پھر میں نے اپنی کتاب ’’تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ شائع کی‘ جو دس برس پہلے ۱۹۵۶ء میں لکھی گئی تھی۔ میں نے ۱۹۶۶ء تک اس کو ہوا نہیں لگنے دی‘ یعنی شائع نہیں کیا‘ اور جب میں نے ۱۹۶۶ء میں اسے شائع کیا تو اسی لیے کہ اب میں اپنی

تحریک کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ جب اس کتاب پر تبصرے آنے شروع ہوئے تو ان کے جواب دیے تاکہ تسلسل کے ساتھ بات واضح ہو جائے۔ درحقیقت اس تحریک کا نقطہ آغاز یہ کتاب تھی اور پھر دوسرا قدم میثاق کا تھا۔ ساتھ ہی میں نے ایک اشاعتی ادارہ ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' قائم کر لیا تھا۔ اس میں کتابچے بھی شائع ہو رہے تھے اور میثاق بھی۔ اس کے بعد میں نے مولانا اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی پہلی جلد بھی شائع کی۔ تدبر قرآن کی اشاعت کا سلسلہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام بھی جاری رہا۔ پہلی جلد' دوسری جلد اور تیسری جلد کے بعد چوتھی جلد بھی ہم نے شائع کی' لیکن اس کے بعد جب رجم کے معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کی رائے سامنے آئی تو اس کی بنا پر میں نے اسے چھاپنا بند کر دیا اور اس کے حقوقِ اشاعت بھی واپس کر دیے۔

سوال: ماہنامہ میثاق کے اجراء کا مقصد پیسہ کمانا نہیں تھا' ذہن سازی اس کا مقصد تھا۔ تو ابتدائی طور پر اسے عوام میں روشناس کرانے میں آپ کو کیا مشکلات پیش آئیں؟

جواب: ظاہر بات ہے کہ کسی بھی نئے پرچے کے لیے شروع میں تو مشکلات ہوتی ہیں۔ اس کا تعارف ہو' اس کا حلقہ وسیع بنے' اس کے بغیر تو بات نہیں چلتی' لہٰذا شروع میں دقتیں رہی ہیں۔ پھر مختلف حضرات کا تعاون بھی حاصل رہا۔ آغاز میں جو ہم خیال بنے وہ بہت کم تھے' لیکن یہ کہ اپنے طور پر اللہ کے فضل و کرم سے سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے اس پر بڑی محنت کی اور بہت کم اخراجات کے ساتھ اسے چلایا۔ مجھے اس ضمن میں صرف ایک صاحب کی معاونت حاصل تھی اور وہ بھی پارٹ ٹائم تھے اور ۴۰' ۵۰ روپے ماہانہ پر کام کرتے تھے' باقی سارا کام میں خود کرتا تھا۔

سوال: جن مقاصد کے پیش نظر اس رسالے کا اجراء کیا گیا تھا' اب پچاس سال گزرنے کے بعد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ مقاصد پورے ہو رہے ہیں؟

جواب: میرے نزدیک ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ نقطۂ نظر یہی تھا کہ تحریک شروع ہو' اس لیے جب میں نے یہ کام شروع کیا تو پہلے ۱۹۷۲ء میں انجمن خدام القرآن قائم ہوئی۔ پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی' جواب ظاہر ہے کہ ایک تناور درخت ہے' اس کی ایک حیثیت اور ایک پہچان بن چکی ہے' تنظیم کا فکر اور اس کی امتیازی سوچ لوگوں کے علم میں ہے' تو اس میں بڑا رول ماہنامہ میثاق کا ہے۔

سوال: ماہنامہ میثاق میں آپ کے جو معاون قلم کار ہیں کیا آپ ان کے معیارِ تحریر سے مطمئن ہیں؟

جواب: ابتدا میں میرے ساتھ ایک تو پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم تھے۔ان کے معیاری مقالات ہوتے تھے۔ پھر ہم جو سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد کرتے تھے' ان میں جو مقالات آتے تھے تو وہ میثاق میں شائع ہوتے تھے۔مولانا اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبرقرآن شائع ہو رہی تھی۔ میں نے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تو پھر میری تقاریر کو اُتار کر میثاق میں شائع کیا گیا اور پھر انہیں کتابچوں کی شکل دی گئی۔اس سے بھی ایک حلقہ بنا ہے۔اب اس وقت معاملہ یہ ہے کہ میثاق چونکہ تنظیم کے ترجمان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے لہٰذا اس میں عام طور پر علمی مقالات شائع نہیں ہوتے ۔۱۹۸۲ء میں ہم نے ایک دوسرا پرچہ ''حکمت قرآن'' بھی شروع کر دیا تھا۔ان کے مابین ہم نے وہ تقسیم رکھی کہ علمی چیزیں تو حکمت قرآن میں شائع ہوں اور دعوتی و تحریکی مضامین میثاق میں ۔حکمت قرآن کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اسے ایک اور صاحب نے شروع کیا تھا۔ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ومغفور نے اس کا آغاز کیا تھا۔وہ بھی بند پڑا تھا' تو اس کا میں نے دوبارہ اجراء کیا۔تو وہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ آج تک شائع ہو رہا ہے۔میثاق کے قلم کاروں کا معیارِ تحریر الحمدللہ اطمینان بخش ہے' لیکن اسے ایسے قلم کاروں کا کوئی خصوصی قلمی تعاون حاصل نہیں رہا جو اپنی ایک خاص شہرت بھی رکھتے ہوں اور خاص پہچان بھی رکھتے ہوں۔

سوال: انجمن خدام القرآن کے ممبران اور رفقائے تنظیم اسلامی نے میثاق کی سرکولیشن بڑھانے کے لیے کوئی خصوصی کردار ادا کیا؟

جواب: خصوصی نہیں۔لیکن بہر حال naturally یہ اسی حلقہ کے اندر ہی پڑھا گیا' کیونکہ یہ ایک تحریک کا نقیب تھا۔

سوال: ماہنامہ میثاق کی گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ قارئین میثاق کے لیے کوئی خصوصی پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: خصوصی پیغام تو میرا وہی ہے جو میں نے بالکل اپنی جوانی میں سیکھا تھا اور جس پر الحمدللہ میں آج تک عمل پیرا ہوں۔وہ یہ ہے کہ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے دین کے ہم سے تین بنیادی تقاضے ہیں۔سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں شریعت اسلامی کی پوری پابندی کریں اور بندگیٔ ربّ کا حق ادا کریں۔اس کے بعد بحیثیت اُمتِ مسلمہ ہمارا فرض

بنتا ہے کہ دین کی دعوت وتبلیغ میں اپنا وقت‘ صلاحیت اور قوت صرف کریں۔ پھر اس کے بعد دین کو ایک نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں‘ تاکہ دنیا کے سامنے اس کی ایک مثال آئے کہ اسلام کیا تعلیمات دیتا ہے‘ جو آج کہیں نہیں ہے۔ تو اصل میں جب تک ہم اپنا مقصد زندگی اس کو نہیں بنائیں گے کہ ہم نے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنی ہے دین کے بنیادی تقاضے پورے نہیں ہوں گے‘ اور یہ ایک انقلابی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے ایک مضبوط اور منظّم جماعت ان لوگوں کی وجود میں آئے جن کے دلوں میں یقین والا ایمان موجود ہو اور عمل میں شریعت موجود ہو۔ وہ لوگ پھر کسی سے بیعت کر کے ایک تنظیم کی شکل اختیار کریں۔ چنانچہ میں نے ایک قافلہ تنظیم اسلامی کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہر شخص کو سوچنا چاہیے۔ اس لیے کہ اقامت دین کی جدوجہد کے بغیر دین کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ ہم انفرادی طور پر جتنے بھی نیک بن جائیں‘ لیکن اگر ہمارے اوپر جو چھت ہے نظام باطل کی ہم اس کے خلاف جدوجہد نہیں کر رہے تو گویا ہم بھی اللہ کے ہاں اس کے حامیوں میں شمار ہوں گے۔ جیسے کہ بش نے مشرف سے کہا تھا: You are with us or against us یعنی تم آج ہمارے ساتھ ہو یا پھر ہمارے مخالف شمار ہو گے‘ اس کے درمیان کوئی لائن نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ بھی کہتا ہے کہ تم میرے بندے ہو تو میرے دین کا جھنڈا اُٹھاؤ‘ اسے قائم کرو‘ اور اگر نہیں تو اس کا معنی یہ ہو گا کہ تم میرے دین کے حامی نہیں‘ تمہارا تعلق اصل میں حزب شیطان سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیں حزب الشیطان سے بچا کر حزب اللہ میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

☆ ☆ ☆

حقیقتِ میثاق

انجینئر نوید احمد

الحمدللہ! یہ امر باعثِ مسرت وتحسین ہے کہ ماہنامہ میثاق کی اشاعت کو نصف صدی مکمل ہوگئی ہے۔ایک انتہائی سنجیدہ جریدے کا اتنے طویل عرصہ تک تسلسل کے ساتھ اجراء بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم کا مظہر ہے۔ یہ فضل وکرم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم ومغفور پر ہوا جنہوں نے اِس جریدے کی اشاعت کا آغاز کیا۔ پھر یہ فضل وکرم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر ہوا جنہوں نے اِس جریدے کو ازسرنو شائع کرنا شروع کیا اور اُن تمام خادمانِ دین پر بھی جنہوں نے کسی بھی انداز سے اِس جریدے کی اشاعت میں مالی‘ جانی اور قلمی تعاون کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن سب رجالِ کار پر اپنے فضل وکرم کا سلسلہ جاری رکھے اور ایک علمی و تحریکی رسالہ کے ذریعے اِن کی خدمتِ دین کی کاوشوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔آمین!

ماہنامہ میثاق کا نام سورۃ المائدۃ کی آیت ۷ سے ماخوذ ہے۔اس آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑦﴾

’’اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہوئی اور اس عہد کو جس کے ذریعہ اُس (اللہ) نے تمہیں پابند کردیا جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی‘ اور (اب) بچو اللہ کی نافرمانی سے۔ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ سینوں میں ہے۔‘‘

مناسب ہوگا کہ ماہنامہ میثاق کی اِس خصوصی اشاعت میں مذکورہ آیت کے حوالے سے میثاق کی حقیقت کو ذہنوں میں تازہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ مذکورہ بالا آیت میں پہلے ایک نعمت کا ذکر ہے اور اِس کے بعد سمع وطاعت کے میثاق کا بیان ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعمت سے کیا مراد ہے؟ میثاقِ سمع وطاعت کا کیا مفہوم ہے؟ اور نعمت اور میثاقِ سمع وطاعت کو یاد

رکھنے کی کیا صورت ہے؟

نعمت کی وضاحت اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۳ میں اس طرح سے آئی ہے:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾

''آج کے دن میں نے مکمل کر دیا تمہارے لیے تمہارا دین اور میں نے پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور میں نے پسند کر لیا تمہارے لیے اسلام کو بطور دین۔''

گویا نعمت سے مراد ہے ''دینِ اسلام'' جس کی تکمیل کا اعلان اس آیتِ مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

میثاق سے مراد ہے اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ''دینِ اسلام'' کو قبول کر لینا۔ سورۃ الحدید آیت ۸ میں اس میثاق کا ذکر ان الفاظ میں آیا:

﴿وَمَا لَکُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾﴾

''تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے جب کہ رسول تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ اور وہ تم سے میثاق لے چکے ہیں اگر تم مومن ہو۔''

اس آیت میں وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ کے الفاظ میں اُس عہد کی طرف اشارہ ہے جو کلمہ پڑھ کر ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ یہ عہد سورۃ التوبۃ آیت ۱۱۱ میں بیان ہوا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے اُن کی جانیں اور مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔''

یہ عہد ہی وہ میثاقِ سمع و طاعت ہے جس کی رُو سے ہم اپنی جان اور اپنے مال کا اللہ کے ہاتھ سودا کر چکے ہیں اور یہ مال و جان ہمارے پاس اللہ کی امانتیں ہیں۔ ایفائے عہد اور ادائے امانت کا تقاضا ہے کہ اب مال و جان اللہ کی اطاعت اور دین کی سربلندی کے لیے اس طرح وقف کر دیے جائیں کہ ہم قتال فی سبیل اللہ کی طرف لے جانے والی راہ پر چل کر فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ کی سعادت حاصل کر سکیں۔ انفرادی زندگی بسر کرنے سے یہ مرحلہ کبھی نہیں آئے گا۔ اس کے لیے

ضروری ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف کسی جماعت سے وابستہ ہو کر فعال طریقہ سے کام کیا جائے تاکہ تحریک تصادم کے مرحلہ تک پہنچ سکے۔ نبی اکرمﷺ نے ۱۵ برس تک یہ تیاری کی۔ دعوت کے ذریعہ ایک جماعت فراہم کی اور تربیت کے ذریعہ اُسے مستحکم کیا۔ نبوت کے ظہور کے ۱۵ برس بعد پھر بدر کے معرکہ سے قتال فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع ہوا۔

نعمت اور میثاقِ سمع و طاعت کو سمجھنے کے بعد اب اِنہیں یاد رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ دین اسلام جیسی نعمت کو نہ صرف قبول کیا جائے بلکہ اِس دین کے تقاضوں کو بھی ادا کیا جائے۔ دین اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّـبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝۱۲۵﴾ (النساء)

''اور اُس سے بہتر دین کس کا ہوسکتا ہے کہ جس نے جھکا دیا اپنا چہرہ اللہ کے لیے اور وہ نیک بھی ہے اور اُس نے ملتِ ابراہیمؑ (یعنی حضرت ابراہیمؑ کے راستے) کی پیروی کی جو بالکل یکسو تھے' اور ابراہیمؑ کو تو اللہ نے دوست بنا لیا تھا۔''

ملتِ ابراہیمؑ کی وضاحت قرآنِ کریم نے اِس طرح سے کی ہے:

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۳۰ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۳۱﴾ (البقرۃ)

''اور کون ہے جو دُوری اختیار کرے ابراہیمؑ کی ملت سے سوائے اُس کے جس نے حماقت میں ڈال دیا اپنے آپ کو۔ اور ہم نے اُن کو چن لیا تھا دنیا میں اور بے شک وہ آخرت میں بھی یقیناً نیک لوگوں میں شامل ہوں گے۔ جب بھی اُن سے کہا اُن کے رب نے کہ فرمانبرداری اختیار کرو' اُنہوں نے عرض کیا کہ میں نے فرمانبرداری اختیار کی تمام جہانوں کے رب کی۔''

ہر معاملہ میں اللہ کی فرمانبرداری اختیار کرنا ہی ملتِ ابراہیمؑ ہے اور یہی میثاقِ سمع و طاعت کا تقاضا ہے۔ اہل ایمان کے لیے لازم ہے کہ وہ میثاقِ سمع و طاعت کو نبھانے کے لیے ملت ابراہیمؑ کی پیروی کریں۔ اِس حقیقت کو سورۃ النور میں یوں بیان کیا گیا:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (النور)

''مومنوں کی بات تو بس یہ ہے کہ جب اُنہیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم) سن لیا اور مان لیا' اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اب تک کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ دینِ اسلام اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اِسے قبول کر لینا دراصل ایک میثاقِ سمع وطاعت ہے۔ اِس میثاق کو یاد رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

جب ہم اللہ کے احکامات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اُن کی تین سطحیں محسوس ہوتی ہیں:

(۱) احکامات کی پہلی سطح وہ ہے جس کا تعلق ہماری اپنی ذاتی زندگی اور اختیار سے ہے۔ مثلاً اللہ کا حکم ہے کہ نماز قائم کرو۔ اِس حکم پر عمل کا ہمیں اختیار ہے۔ اگر ہم اِس حکم پر عمل میں کوتاہی کرتے ہیں تو سراسر ہمارا اپنا ہی قصور ہے۔ اِسی طرح اور بھی کئی ایسے احکامات ہیں جن پر عمل کرنے میں ہمارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس حوالے سے اپنی مکمل اطاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(۲) اللہ کے احکامات کی دوسری سطح کا تعلق ہمارے گھر اور معاشرے سے ہے۔ مثلاً اللہ کا حکم ہے کہ اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ (التحریم:۶)۔ اِسی طرح معاشرتی لحاظ سے ہماری ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو نیکی کی تلقین کریں اور برائیوں سے روکیں (آلِ عمران:۱۱۰)۔ اِس سطح پر ہم دوسروں سے عمل کرانے کا اختیار تو نہیں رکھتے لیکن بہرحال اُنہیں سمجھا سکتے ہیں۔ لہٰذا اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ خلوص و اخلاص' دلسوزی اور دعوت وتبلیغ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے گھر والوں اور اپنے معاشرہ میں بسنے والوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے وعظ ونصیحت کریں اور اللہ سے اُن کے حق میں ہدایت کی دعا کریں۔

(۳) اللہ کے احکامات کی تیسری سطح کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ اللہ کی اطاعت والے نظام کو قائم کرو (الشوریٰ:۱۳) اور لوگوں کے معاملات کا فیصلہ عدل کے ساتھ کرو (النساء:۵۸)۔ جو لوگ اللہ کی عطا کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے

وہ لوگ عمل کے اعتبار سے کافر ہیں (المائدۃ:۴۴) ۔اب یہاں عوام الناس لاچار و بےبس ہیں اوراختیار صاحبانِ اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔البتہ ہماری ذمہ داری ہے کہ کسی ایسی تحریک میں شامل ہوکر فعال کردار ادا کریں جس کا مقصد شریعت کا نفاذ اور دین کا غلبہ ہو۔سورۃ الحج کی آخری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾

''اوراللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ میثاقِ سمع وطاعت کو یاد رکھنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا تینوں سطحوں کے احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِن احکامات پر عمل کے لیے جماعتی زندگی ناگزیر ہے۔اکیلا انسان نہ انفرادی اعتبار سے اللہ کی کلی اطاعت پر قائم رہ سکتا ہے' نہ دعوت وتبلیغ کا کام مؤثر طور پر انجام دے سکتا ہےاور نہ ہی غلبۂ دین کی جدوجہد کے لیے نظامِ باطل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتا ہے۔لہٰذا اقامتِ دین کے مقصد کے لیے قائم کسی اجتماعیت میں شمولیت ضروری ہے۔حضرت عمرؓ سے مروی حدیث موقوف ہے :

((اِنَّهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ))

''یقیناً اسلام ہے ہی نہیں بغیر جماعت کے اور جماعت ہے ہی نہیں بغیر امارت کے اور امارت ہے ہی نہیں بغیر (امیر کے احکامات کی) اطاعت کے''۔(سنن دارمی)

حضرت حارث الاشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (سنن الترمذی' مسند احمد)

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: جماعت اختیار کرنے کا' سننے کا' اطاعت کرنے کا' ہجرت کرنے کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا۔''

اللہ تعالیٰ سے ہمیں رقتِ قلب سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ ہمیں مذکورہ بالا میثاق کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

جو لوگ اِس میثاق کو پورا کرتے ہیں اُن کے بارے میں خوشخبری ہے :

﴿اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ

اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيۡنَ يُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَلَا يَنۡقُضُوۡنَ الۡمِيۡثَاقَ ﴿۲۰﴾﴾ (الرعد)

''اور بھلا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے ربّ کی طرف سے وہی حق ہے کیا وہ ایک اندھے کی مانند ہوسکتا ہے؟ یقیناً نصیحت تو حاصل کرتے ہیں وہ لوگ جو واقعی عقل مند ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور وہ کبھی بھی میثاق کو نہیں توڑتے۔''

جو لوگ میثاق کو پورا نہیں کرتے وہ قرآنِ مجید سے ہدایت کے حصول سے محروم رہتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ آیات ۲۶ اور ۲۷ میں فرمایا گیا :

﴿...... يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا ۙ وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ ۖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾﴾

''...... اِسی (قرآن) کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے بہتوں کو اور اِسی کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے بہت سوں کو۔ البتہ اِس کے ذریعہ سے وہ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقوں کو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ سے عہد کر کے اُسے توڑ دیتے ہیں اور کاٹتے ہیں اُس کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارے میں جانے والے ہیں۔''

نیز یہ کہ میثاق کو پورا نہ کرنے والوں کے لیے سورۃ الرعد آیت ۲۵ میں وعید ہے :

﴿وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾﴾

''اور وہ لوگ جو اللہ سے عہد کر کے اُسے توڑ دیتے ہیں اور کاٹتے ہیں اُس کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں' ایسے لوگوں کے لیے لعنت ہے اور اُن کے لیے برا گھر ہے۔''

ماہنامہ میثاق کے گزشتہ پچاس سال کے صفحات شاہد ہیں کہ اِس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مختلف اسالیب میں میثاقِ سمع و طاعت کو پورا کرنے کی دعوت دی جاتی رہی ہے تا کہ اُنہیں روزِ قیامت کی رسوائی اور جہنم کے عذاب سے بچایا جاسکے اور اُن کے لیے جنت کی ابدی نعمتوں کے حصول کی سبیل کی جاسکے۔ یہ ایک مبارک مشن ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک ہم سب کو خلوص و اخلاص کے ساتھ یہ مشن جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ماہنامہ 'میثاق' میری نظر میں

'معاصر اہلِ قلم حضرات کے تاثرات سے انتخاب'

(۱)

میثاق مسلمانانِ عالم کی دینی وملی راہنمائی کر رہا ہے٭

ماہنامہ ''میثاق'' لاہور' ماہنامہ ''ذکریٰ جدید'' نئی دہلی کے تبادلے میں گزشتہ کئی سالوں سے مستقل طور پر موصول ہو رہا ہے۔ الحمد للہ اس کے مشمولات سے ادارے کے تمام افراد استفادہ کرتے ہیں۔ ماہنامہ میثاق کی مسلسل اشاعت کے پچاس برس پورے ہونے پر ہم آپ کو اور آپ کے ادارے کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ادارت وسرپرستی میں شائع ہونے والا یہ ماہنامہ اپنی پوری ذمہ داری اور اعلیٰ معیار کے ساتھ مسلمانانِ عالم اور خصوصاً مسلمانانِ پاکستان کی دینی وملی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس رسالہ نے دیگر تمام رسائل وجرائد کی موجودگی میں اپنی انفرادیت' اعلیٰ تحقیقی معیار' واضح اور معتدل نظریات اور صاف وشفاف فکر اور رجحانات نیز پاکستان اور پوری دنیا میں غلبۂ حق کے تئیں اس کی اپنی ترجیحات اور اس طرف خصوصی اہتمام اور توجہ کی وجہ سے دنیا بھر کے عوام وخواص کے دلوں میں اپنی ایک خصوصی جگہ بنائی ہے' جس کی وجہ سے اس کے قارئین اور اس سے دلچسپی اور محبت رکھنے والوں کا حلقہ کافی وسیع ہوا ہے اور اب اس کی شہرت و افادیت برصغیر سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ اس کے تمام مشمولات معیاری ہوتے ہیں' زبان وبیان کے لحاظ سے بھی اور مواد کے لحاظ سے بھی۔ اس میں لکھنے والوں کی اپنی ایک ٹیم ہے جو مستقل اس میں لکھتے ہیں اور اپنا قیمتی وقت دے کر پوری دل جمعی کے ساتھ اس کی نوک و پلک سنوارنے کی کوشش اور جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔

اپنے ان دلی احساسات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر میں آپ کو اور

ادارے کے تمام افراد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مدیر ذکریٰ جدید‘ والد محترم جناب مولانا محمد یوسف اصلاحی صاحب اس وقت اپنے امریکہ کے دورے پر ہیں‘ ان کی جانب سے بھی بے شمار تہنیات قبول فرمائیں۔ یہ سطریں میں ان کی ہی نمائندگی کرتے ہوئے ارسال خدمت کر رہا ہوں‘ اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

طالب دعا ڈاکٹر سلمان اسعد
معاون مدیر
ماہنامہ ذکریٰ جدید‘ نئی دہلی (انڈیا)

(۲)

نصف صدی کا یہ سفر دین کے خادمان کے لیے حوصلہ افزا ہے

ماہنامہ میثاق عرصہ سے زیر مطالعہ رہتا ہے‘ اس کے مضامین معیاری اور فکر انگیز ہوتے ہیں جو ہمارے یہاں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں‘ خصوصاً ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پراثر اور پر مغز تحریریں رسالے کی جان ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے کیونکہ ایک مقصد ہے اس لیے ان کی تحریروں میں تحریکی انداز ہے‘ وہ ایک طرف اپنے مضبوط دلائل سے دماغ کو متوجہ کرتے ہیں‘ دوسری طرف تحریر کے بین السطور سے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ اس طرح دل اور دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں تنقید ہے مگر جارحیت نہیں ہے‘ یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں اکابر کی خدمات کا اعتراف و اقرار ان کی وسعت قلبی کو ظاہر کرتا ہے۔ جس فراخ دلی کے ساتھ وہ جد امجد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی‘ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی خدمات کا ذکر کرتے ہیں اس سے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اور سب سے بڑی بات جو بنیادی ہے وہ ان کی سلامتی فکر اور عقیدے کی پختگی ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ میثاق اشاعت کے پچاس سال مکمل کر رہا ہے‘ نصف صدی کا اس کا یہ سفر دین کی خدمت کرنے والوں کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ بہت بہت مبارک!

(مفتی) فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی‘ طارق عمیر عثمانی
دار السلام‘ مالیر کوٹلہ‘ پنجاب (انڈیا)

(۳)

تحریک رجوع الی القرآن کا اثر نا قابلِ بیان ہے

حضرت والد محترم جناب مولانا عبدالکریم پاریکھؒ کا تا زندگی مشن رہا کہ اُن کانوں تک کلام اللہ کو پہنچایا جائے جو صدیوں سے اس سے محروم ہیں...... وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت میں رجوع کی کیفیت زوالِ بغداد کے بعد شروع ہوئی اور اس کے سرخیل رہے امام ابن تیمیہؒ۔ رجوع الی القرآن کی تحریک ہمارے ملک میں ولی اللہ خاندان سے شروع ہوئی۔ تراجم کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن کوئی بھی ترجمہ تلاوت کی طرح نہ تو بار بار پڑھا جاتا ہے اور نہ ہر نماز، خطبہ یا وعظ میں سنا جاتا ہے۔ پھر ایک صدی کے بعد ہر مکتبہ فکر نے اپنے اپنے ترجمے اور تفاسیر پیش کر کے بات کو وہیں لا کر چھوڑا۔ اب ضروری ہے کہ عام آدمی کم از کم قرآن شریف کے معنی سے اتنا تو واقف ہو جائے کہ جب وہ خود تلاوت کرے، چاہے تلاوت سنے، چاہے نمازوں میں پڑھے یا سنے، چاہے تراویح میں سنے، چاہے خطبات میں سنے، اسے توحید اور آخرت کے موٹے موٹے پوائنٹس بار بار اسٹرائک کرتے رہیں۔ اور واقعی اس تحریک کا اثر نا قابل بیان ہے۔ اس کا مشاہدہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ پھر بظاہر انسان اپنے فرقے اور مسلک پر ہی دکھائی دے لیکن اس کے اندرون میں توحید کی آبِ حیات ہو۔ قرآن شریف کا ازلی پیغام اس تک گاہے بگاہے خود بخود پہنچتا رہے اور اپنے اخلاق کو وہ سدھارتا رہے۔

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مساعی جمیلہ کے حضرت مولاناؒ معترف رہے۔ ۱۹۸۳ء میں قرآن اکیڈمی لاہور کی دعوت پر ایک ہفتہ ڈاکٹر صاحب کے مہمان بھی رہے اور قرآن اکیڈمی میں لیکچر بھی ہوئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے اس دوران ہمارے ملک کے دو دورے بھی ہوئے اور ہر دورے میں دونوں ہی بزرگوں کی فون پر طویل گفتگو ہوا کی۔ دراصل پڑوس سے آنے والوں کے لیے ہمارے یہاں تین شہروں سے زیادہ سیر کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ محترم ڈاکٹر صاحب اس وجہ سے ہمارے شہر تشریف نہ لا سکے۔ حضرت والد صاحب کو بھی افسوس رہا کہ پہلی بار وہ خود دعوتی دورے پر ملک کے دور دراز کے علاقے میں تھے اور دوسرے موقع پر خود عارضہ بصارت اور صحت سے معذور تھے کہ سفر کر کے ڈاکٹر صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کر سکیں۔

ماہنامہ میثاق اور حکمت قرآن دونوں ہی رسالوں کا وہ تازندگی مطالعہ کرتے رہے۔ عمر کے آخری چار سال بینائی کا عارضہ درپیش رہا۔تب بھی وہ اسٹاف یا اہل خاندان سے دونوں ہی رسالوں کو پڑھوا کر سنتے تھے۔اب بھی دونوں رسائل ہمارے مطالعے میں ہوا کرتے ہیں۔ یہاں احباب کے مطالعے میں بھی دونوں ہی رسالے رہتے ہیں اور قرآن اکیڈمی لاہور کے حالات اور کوائف سے معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ سلام۔

فقط والسلام

ناخلف

عبدالغفور پاریکھ

ناگپور (انڈیا)

(۴)

نصف صدی میں میثاق نے اپنے اہداف سے روگردانی نہیں کی

متعدد جرائد و رسائل کی موجودگی میں ماہنامہ ''میثاق'' کی انفرادیت ہمیشہ قائم رہی ہے۔ اپنے سفر کے آغاز میں اس نے جو اہداف متعین کیے' نصف صدی گزر جانے کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہونے پائی۔ میثاق کے لغوی مفہوم کا اقتضا بھی یہی تھا کہ اس عہد و پیمان سے مضبوط تمسک برقرار رہے جو اس نے اپنے ربِّ کریم اور قارئین سے باندھ رکھا ہے۔ اللہ کی دھرتی پر اللہ کے نظام کی تنفیذ ہو' پاکستان جس کا قیام لا الٰہ الا اللہ کے نعرے کا رہین منت تھا اس میں اللہ کا قانون جاری و ساری ہو اور یوں ایک صالح' نیک اور عدل وانصاف کا نقیب معاشرہ معرضِ وجود میں آئے اور یہ اسلامی جمہوریہ امن وسلامتی کا گہوارہ ہو۔ یہ اسلامی انقلاب اعتصام بحبل اللہ ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ میثاق نے اس کا مؤثر اور دل آویز اہتمام کیا' میثاق کے مدیر مسئول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بڑے دل نشیں انداز میں قرآن حکیم کی تفہیم کا انصرام فرمایا' اس کے مشکل نکات کی توضیح سادہ انداز میں اور دلچسپ پیرائے میں کی۔ ''بیان القرآن'' کا حصہ اس ماہنامے کے ماتھے کا جھومر رہا ہے۔

''عرضِ احوال'' اور ''تذکرہ وتبصرہ'' کے صفحات ملک کے سلگتے ہوئے مسائل پر سنجیدہ تبصروں کے لیے مختص رہے۔ ''اُسوہ وسیرت'' کے موضوعات نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ

کے حسن سے مجلی رہے اور آپؐ کی دعوت کے منہج کے تمام تر پہلوؤں کو حسن وخوبی سے اُجاگر کرنے کے لیے وقف رہے۔ ایسے موضوعات کا تنوع موجود رہا جو سیاست' معیشت' معاشرت اور اخلاقیات کی مثبت ومنفی جہتوں کو مبرہن کرتے ہوں۔''

میثاق میں بالعموم ثقہ اور مستند روایات کا تسلسل قائم رہا ہے' املاء وانشاء کی اغلاط نہ ہونے کے برابر رہی ہیں۔ قرآن حکیم کی آیات اور احادیث کا متن نقل کرنے میں حزم واحتیاط کا تقاضا ملحوظ رہا ہے۔ حوالہ جات کی نشان دہی میں پوری احتیاط برتی گئی ہے۔ تمام تر مضامین کا اسلوبِ نگارش سادہ' سلیس' رواں' دلچسپ اور عام فہم رہا ہے۔ میثاق نے قارئین کو فکری غذا مہیا کرنے' تجدید واحیائے دین کے تقاضوں کو گزرتے حالات کی جدتوں سے ہم رکاب کرنے اور گردوپیش کے بارے میں ثقہ معلومات فراہم کرنے میں مقدور بھر سعی وکاوش جاری رکھی ہے۔ اس کا کردار اُمتِ مسلمہ میں اتحاد ومؤانست پیدا کرنے کا رہا ہے۔ مسلکی دوائر میں تقید کی بجائے اس نے قرآن وسنت سے اصل دعوت کو مرکز ومحور بنائے رکھا۔ گزشتہ چند برسوں سے میں میثاق کا قاری ہوں اور قلمی خدمت بھی کر رہا ہوں' میں نے میثاق کو جیسا پایا اپنے احساسات زیبِ قرطاس کر دیے۔

میثاق کو صوری طور پر زیادہ جاذبِ نظر بنانے کی ضرورت ہے۔ قارئین کی آراء وتبصروں کے لیے صفحات بھی مختص کیے جائیں۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لیے کچھ اوراق وقف ہوں' عالمی سیاست پر وقیع مضامین شامل ہوں' عصری اسلامی تحریکوں کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا جائے' راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے اور بہتر لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے تجاویز دی جائیں تا کہ وہ اپنے حالات کے تناظر میں راہِ عمل اپنا سکیں' نقد وانتقاد میں اخلاص وللّٰہیت کارفرما ہو' روشن خیالوں کے ملحدانہ خیالات کا جدید انداز میں پوسٹ مارٹم ہو—— مختصراً خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہے۔

عتیق الرحمٰن صدیقی

ہری پور ہزارہ

(۵)

اسلامی صحافت کا یہ روشن ستارہ پچاس برس سے جگمگا رہا ہے

میں ایک عرصہ سے ماہنامہ ''میثاق'' کا تسلسل کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہوں اور اس طرح

میرے ذوق کی تسکین ہو رہی ہے۔ ''میثاق'' بلا شبہ ان علمی' فکری اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے گئے ''میثاق'' کو پختہ رکھنے کا احساس دلاتے ہیں۔ اسلامی فکر اور نظریے کی آبیاری کے ساتھ قوتِ عمل پیدا کرنے میں ''میثاق'' عظیم کردار کا حامل ہے اور اسلامی صحافت میں ایک روشن ستارے کے طور پر پچاس برس سے جگمگا رہا ہے۔ میں ''میثاق'' کی گولڈن جوبلی (اشاعت کے پچاس سال مکمل ہونے) پر انجمن خدام القرآن اور اس کے سرپرست اعلیٰ جناب ڈاکٹر اسرار احمد کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

عبدالرؤف فاروقی

مدیر ماہنامہ ''مکالمہ بین المذاہب'' لاہور

خطیب جامع مسجد خضراء' سمن آباد لاہور

(٦)

ڈاکٹر صاحب محض مدیر ہی نہیں' اپنی شخصیت میں ایک تحریک ہیں

مکتبہ خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ماہنامہ ''میثاق'' کی اشاعت کے پچاس سال مکمل ہو چکے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں اس جریدے نے بظاہر جو ترقی کی ہے اس کا عکس ماضی قریب اور دُور کے جرائد دیکھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ ان پچاس برسوں میں ایک نسل پیدا ہو کر بوڑھی ہو چکی ہے' جبکہ کئی نسلیں جوان اور بوڑھی بھی ہو چکی ہیں۔ ان تمام نسلوں کی تربیت میں بلاشبہ ماہنامہ میثاق کا بڑا حصہ ہے۔ قرآن' حدیث اور اسلامی تاریخ کے علوم کے فروغ میں جس جانفشانی سے ماہنامہ میثاق کام کر رہا ہے شاید کوئی اور جریدہ نہیں کر رہا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جو اس جریدے کے مدیر مسئول ہیں وہ محض مدیر ہی نہیں ہیں بلکہ اپنی شخصیت میں ایک تحریک ہیں۔ انہوں نے جس خوبصورتی سے اس جریدے کو آج تک چلایا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین!

خالد نجیب خان

''فیملی میگزین''

لاہور

(۷)

میثاق اُمت مسلمہ کی راہنمائی کا فریضہ ادا کر رہا ہے

ماہنامہ ''میثاق'' بلاشبہ اُمت مسلمہ کی راہنمائی اور ہدایت دونوں فرائض کما حقہ ادا کر رہا ہے۔ خصوصاً نائن الیون کے بعد دنیا کے بگڑے ہوئے منظر نامے نے جو مسائل مسلمانوں کے لیے پیدا کیے اور نوجوان نسل کو گمراہ کرنے کے لیے جس نوعیت کا پراپیگنڈا کر کے ان کے اذہان میں زہر گھولا جا رہا ہے' اس کا مدلل اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ جواب ماہنامہ ''میثاق'' میں ملتا ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی دینی بصیرت پر تبصرہ تو میری مجال نہیں' صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ آپ جدید دور کے مسلم نوجوانوں کو درپیش مسائل' ان مسائل کا پس منظر اور پیش منظر جس حکمت و دانائی سے بیان فرماتے ہیں وہ کچھ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اللھم زد فزد!

طارق اسمٰعیل ساغر

(۸)

میثاق کی تحریریں عمل کا جذبہ پیدا کرتی ہیں

سکول کی تعلیم کے دوران ہی مجھے جستجو ہوئی کہ قرآن وسنت پر مبنی اسلامی تعلیمات سے واقفیت حاصل کی جائے۔ چنانچہ جہاں مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا عالم دین تقریر کرنے والا ہے یا اجتماعِ جمعہ سے خطاب کرنے والا ہے تو میں وہاں حاضر ہونے کی کوشش کرتا۔ اس شوق اور جستجو کے نتیجہ میں مَیں نے برصغیر کے بہت سے مشاہیر اہل علم کو سنا' مگر علمی پیاس بڑھتی ہی گئی۔ تا آنکہ ۱۹۶۷ء میں ایک دن اخبار میں ڈاکٹر اسرار احمد کے درس قرآن کا اشتہار دیکھا۔ میری رہائش لاہور میں چوبرجی کے قریب تھی اور ڈاکٹر صاحب کا درس سمن آباد کی ایک کوٹھی میں تھا۔ میں اپنی عادت کے مطابق وقت سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گیا اور شروع سے اخیر تک ان کا درس سنا۔ زیر درس آیات پر آپ کی گفتگو نہایت جامع تھی۔ آپ نے آیات کا ربط واضح کیا۔ آپ کی ہر بات فطرتِ سلیمہ کے مطابق اور صاف ستھری تھی۔ آپ کا درس گروہی اور مسلکی اختلافات سے بالاتر تھا۔ آپ کا زور اس بات پر تھا کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی حیثیت

اور صلاحیت کے مطابق دعوتِ دین اور اسلام کی سربلندی کے لیے کام کرے۔ درس کے بعد میرا تاثر یہ تھا کہ ''جا ایں جا است'' چنانچہ میں ڈاکٹر صاحب کے اس ہفتہ وار درس قرآن میں حاضر ہوتا رہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

ماہنامہ میثاق کا اجراء مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں کیا تھا' جس کی اشاعت ۱۹۶۵ء میں تعطل کا شکار ہو گئی۔ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۱۹۶۶ء میں اس کی ادارت سنبھالی اور اسے غلبہ وا قامت دین کی جدوجہد کا حدی خواں بنا دیا۔ یہ ماہنامہ آج بھی پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔اس کے مضامین ٹھوس اسلامی عقائد پر مبنی اہل علم کی کاوشوں کا مظہر ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ تنظیم اسلامی کی اسلامی انقلابی فکر کا ترجمان ہے۔

میثاق میں ڈاکٹر صاحب کی تحریریں اور دروس شائع ہوتے ہیں جو دین کا فہم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے انتہائی مؤثر اور مفید ہوتے ہیں اوران سے قاری کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ میثاق میں شائع ہونے والے مضامین قرآن وسنت کی تعلیمات پر مبنی مسلکی اور گروہی اختلافات سے پاک ہوتے ہیں جن میں اسلامی اخوت کو فروغ دینے اور تعصّبات سے بالاتر ہو کر دین کی خدمت کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اوراس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان میثاقِ اَلست سے باخبر رہے اور اپنی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق جہاں اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنائے وہاں اس کی تبلیغ واشاعت میں بھی مقدور بھر حصہ لے۔ گویا ایک مسلمان کی زندگی مثبت جدوجہد کا مظہر ہو جس میں ایثار وقربانی بھی ہو اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا بھی اہتمام ہو۔

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
قرآن اکیڈمی لاہور

دعوتِ رجوع الی القرآن کا اہم سنگ میل

مطالعہ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب

تعارف و تاریخی پس منظر

☆

ڈاکٹر اسرار احمد

اصلاً قرآن حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم اور حقیر سے خادم —— لیکن عرفِ عام میں ایک مدرس و مبلغِ قرآن کی حیثیت سے راقم کا تعارف اس وقت بہت بڑے پیمانے پر ہو چکا ہے —— اور اس بات میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو زبان بولی یا کم از کم سمجھی جاتی ہے وہاں کے مسلمانوں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جو لوگ اپر مڈل کلاس اور لوئر ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں دین و مذہب سے بھی عملی نہ سہی کچھ ذہنی و جذباتی لگاؤ موجود ہے' ان کے گھروں میں مولانا مودودی مرحوم کی تفہیم القرآن کا حسین اور دیدہ زیب set بھی لازماً بک شیلف کی زینت بنا ہوتا ہے —— اور میرے قرآن حکیم کے دروس اور دیگر دینی و مذہبی اور سیاسی و ملی موضوعات پر خطابات کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں' اور اب سی ڈیز (C.D.s) اور ڈی وی ڈیز (D.V.D.s) کا بھی معتد بہ اسٹاک موجود ہوتا ہے۔

یہ قرآنی دعوت' جواب تحریک رجوع الی القرآن یا تحریک تعلم و تعلیم قرآن کی صورت اختیار کر چکی ہے' اس کی بنیاد کا پتھر مطالعۂ قرآن حکیم کا ایک منتخب نصاب تھا جس کے بعض اسباق کے دروس تو میں زمانۂ طالب علمی (۱۹۵۲ـ۵۳ء) ہی سے دیتا چلا آ رہا تھا جو بالعموم پسند کیے جاتے تھے —— لیکن ۱۹۶۵ء میں جب میں اس تحریک کے آغاز کے ارادے سے

لاہور واپس آیا (واضح رہے کہ ۱۹۵۴ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس سے فراغت کے بعد میں والدین کے پاس منٹگمری‘ حال ساہیوال منتقل ہو گیا تھا) تو اس تحریک کی آبیاری سات سال تک تو میں نے تن تنہا کی (یعنی نہ پشت پر کوئی ادارہ تھا نہ تنظیم یا جماعت) لیکن پھر اس کے بطن سے اوّلاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ولادت ہوئی اور پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی منصۂ شہود پر آئی۔ اُس وقت سے میں نے نہ صرف یہ کہ بفضلہٖ تعالیٰ ایک جانب اِس منتخب نصاب کی ’چکی پیسنی‘ شروع کی (چنانچہ لاہور کے ایک معروف صحافی نے جب مجھ پر ایک نجی گفتگو میں قرآن کا قوّال ہونے کی پھبتی چست کی تو میں نے اس پر ہرگز کوئی برا نہیں منایا بلکہ اسے ایک امرِ واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کیا)۔ اور دوسری جانب اس نصاب میں وقتاً فوقتاً اضافے کیے —— یہاں آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس نصاب کے تاریخی پس منظر اور مقاصد و مراحل تدوین جاننے کے لیے میری وہ تحریر پڑھ لی جائے جو میں نے اب سے تقریباً تیس سال قبل اس وقت سپردِ قلم کی تھی جب اس منتخب نصاب میں جو قرآنی آیات اور سورتیں شامل ہیں ان کے صرف با ترجمہ متن کو ایک علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا تاکہ محفل درس میں شریک حضرات کے سامنے ان دروس کا متن بھی موجود رہے —— وھو ھذا:

> ’’آغاز ہی میں یہ بات عرض کر دینی مناسب ہے کہ یہ نصاب راقم کا ’طبع زاد‘ نہیں ہے بلکہ اس کا اصل ڈھانچہ مولانا امین احسن اصلاحی کا تیار کردہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۵۲۔۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف اسلامی جمعیت طلبہ لاہور و پنجاب کا ناظم تھا اس نے جمعیت کے زیرِاہتمام طلبہ کے لیے دو تربیتی کیمپ منعقد کیے تھے‘ ایک دسمبر ۱۹۵۱ء میں کرسمس کی تعطیلات میں اور دوسرا ۱۹۵۲ء کی تعطیلاتِ موسم گرما میں۔ ان تربیت گاہوں میں قرآن حکیم کا درس مولانا اصلاحی نے دیا تھا اور اس غرض سے انہوں نے ایک نصاب تجویز کیا تھا جو درج ذیل ہے:
>
> (۱) انسان کی انفرادی زندگی کی رہنمائی کے لیے سورۂ لقمان کا دوسرا اور سورۃ الفرقان کا آخری رکوع۔
>
> (۲) عائلی زندگی سے متعلق —— سورۃ التحریم مکمل۔
>
> (۳) قومی‘ ملی اور سیاسی زندگی کی رہنمائی کے ذیل میں سورۃ الحجرات مکمل۔
>
> (۴) فریضہ اقامت دین کے ذیل میں سورۃ الصّف مکمل۔

(۵) اور تحریک اسلامی سے متعلق مختلف مسائل میں رہنمائی کے ذیل میں سورۃ العنکبوت مکمل۔
راقم کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بطور ناظم ان دونوں تربیت گاہوں میں شرکت کا موقع ملا اور یہ مقامات اس نے دوبار مولانا اصلاحی سے براہِ راست پڑھے اور راقم نے ان مقامات کو اس طرح اخذ کرلیا کہ ''بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً'' (میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت) کے مصداق انہیں آگے پڑھانے کے لیے بھی کسی قدر اعتماد پیدا ہوگیا۔ چنانچہ زمانہ طالب علمی میں جمعیت کے اجتماعات میں بھی راقم مطالعہ قرآن کی ذمہ داری نبھاتا رہا' تعطیلات کے زمانے میں ساہیوال میں جماعت اسلامی کے اجتماعات میں بھی ان مقامات کا درس دیتا رہا اور رمضان المبارک کے ایک تربیتی پروگرام میں مکمل نصاب بھی پڑھایا۔ ۱۹۵۴ء میں ملتان میں منعقدہ جمعیت کی ایک تربیت گاہ میں راقم نے پھر یہ نصاب اسی تدریج کے ساتھ پڑھایا۔ بعد میں جب ساہیوال میں راقم نے ایک 'اسلامی ہاسٹل' قائم کیا تو اس میں مقیم طلبہ کو بھی راقم نے اس پورے نصاب کا درس دیا۔ اس کے بعد جب راقم کراچی میں تھا تو وہاں بھی مقبولِ عام ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک حلقہ قائم کرکے اسی منتخب نصاب کا درس دیا۔ بعدۂ لاہور میں ''حلقہ ہائے مطالعہ قرآن'' کے اُس سلسلے کی اساس بھی راقم نے اسی کو بنایا جس نے اللہ کے فضل وکرم سے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کرلی!

البتہ اس عرصے کے دوران میں وقتاً فوقتاً راقم اس بنیادی نصاب میں اضافے کرتا رہا' جن سے اس نصاب کی ایک واضح بنیاد بھی قائم ہوگئی اور مختلف مقامات کے مضامین میں جو فاصلے تھے وہ بھی بہت حد تک پاٹ دیے گئے۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی خود راقم یا کوئی اور شخص اس میں مزید اضافہ کرسکے۔ تاہم اس وقت راقم کا گمان ہے کہ ایک خاص نقطہ نظر سے قرآن حکیم کا جو انتخاب اس نصاب میں کیا گیا ہے وہ بہت حد تک مکمل بھی ہے اور نہایت مفید بھی۔

آگے چلنے سے پہلے اس ''خاص نقطہ نظر'' کی وضاحت بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک مسلمان کے سامنے یہ بات بالکل واضح ہوجائے کہ اُس کے دین کے تقاضے اُس سے کیا ہیں اور اُس کا ربّ اس سے کیا چاہتا ہے؟ گویا دین کے تقاضوں اور مطالبوں کا ایک اجمالی لیکن جامع تصور پیش کرنا اس انتخاب کا اصل مقصود ہے' ویسے ضمناً اس سے خود دین کا ایک جامع تصور بھی آپ سے آپ واضح ہو جاتا ہے اور محدود مذہبی تصورات کی جڑیں خود بخود کٹتی چلی جاتی ہیں۔

ایک عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس منتخب نصاب کو یکجا شائع کر دیا جائے۔ لیکن بوجوہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہر کام کے لیے وقت معین ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اسے لوگوں کے لیے مفید بنائے اور اسی سے اجر و ثواب کی اُمید ہے۔

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ''

اب صحیح تعداد تو یاد نہیں ہے لیکن ۱۹۶۵ء سے شروع ہونے والے تحریکی سفر کے دوران میں راقم نے اس منتخب نصاب کا کم از کم پچیس بار درس دیا ہے۔ چنانچہ جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا' لاہور کی مختلف آبادیوں میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کی ہفتہ وار مجالس میں اس کا درس دیا گیا۔ پھر جامع مسجد خضراء' سمن آباد میں مرکزی حلقہ درس قائم ہوا تو اس میں اتوار کی صبح کے ہفتہ وار دروس میں اس کی دوبارہ تکمیل کی گئی —— اور پھر جب یہ مرکزی درس لاہور کے مرکز یعنی مسجد شہداء' مال روڈ' پر منتقل ہوا تو وہاں بھی اس کا دوبار درس دیا گیا' ایک بار اتوار کی صبح کی ہفتہ وار نشست میں اور پھر ایک بار مسلسل چالیس روز تک روزانہ مغرب اور عشاء کے مابین درس میں۔ پھر جب میری ۱۹۷۷ء میں خطابتِ جمعہ مسجد دارالسلام' باغ جناح' میں منتقل ہوئی تو وہاں بھی آغاز اسی نصاب کے بیان سے ہوا۔ پھر بیرون لاہور جب بھی خطاب کی دعوت موصول ہوئی اسی نصاب کے مختلف اسباق بیان ہوتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی میں ماہانہ درس قرآن میں بھی اس کی تکمیل کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ کراچی کے ہر سفر کے دوران وہاں کی مساجد میں دروس اور خطاباتِ جمعہ میں بھی اسی کے اسباق بیان ہوتے رہے —— اس کے علاوہ اس نصاب کے درس کے لیے کریش پروگرام کی حیثیت سے لاہور' کوئٹہ اور راولپنڈی میں ایک ایک ماہ کی ''قرآنی تربیت گاہوں'' میں یہ نصاب بیان ہوا —— اور دو مرتبہ تو آٹھ آٹھ دنوں کی تربیت گاہوں میں کل نصاب مکمل کیا گیا جس کے لیے پہلے اور آخری اتوار کو کچھ وقفوں کے ساتھ آٹھ آٹھ گھنٹے کے دروس ہوئے اور دورانِ ہفتہ چار چار گھنٹے درس ہوا۔ اس نوعیت کا ایک کریش پروگرام لاہور میں مسجد خضراء سمن آباد میں ہوا اور دوسرا جمعیت الفلاح ہال کراچی میں!

بیرونِ پاکستان اس نصاب کا بوٹا اوّل اوّل ۸۰۔۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) میں لگا جب ان دو سالوں میں روزانہ شام کے درس کے مسلسل چودہ چودہ دن پروگرام ہوئے' جن میں اس

نصاب کی تکمیل کی گئی —— اور پہلی بار وہیں ان دروس کے آڈیو کیسٹ اعلیٰ معیار پر تیار کیے گئے‘ جو پھر وہاں سے دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے immigrants کے ذریعے دور دراز کے ممالک تک پہنچے۔ (یہ کام لکھنؤ (بھارت) سے تعلق رکھنے والے انجینئر جناب سمیع اللہ خان صاحب نے کیا تھا—— اللہ انہیں اس کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین!) ——

اس کے ساتھ ساتھ لاہور میں اولاً مسجد خضراء اور پھر مسجد شہداء میں پورے قرآن حکیم کا سلسلہ وار درس بھی دوبار مکمل ہوا —— جس کے کچھ حصوں کی آڈیو اور آخری حصے کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی محفوظ ہے—— ان سب پر مستزاد بفضلہٖ تعالیٰ ۱۹۸۴ء سے ہم نے رمضان المبارک میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا‘ جس میں ہر چار رکعتوں سے پہلے اُن میں پڑھے جانے والی آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے۔ ان میں سے گزشتہ پچیس سالوں میں سے کم از کم پندرہ بار تو یہ خدمت خود راقم نے سرانجام دی‘ جن میں تین بار کراچی‘ ایک بار ملتان اور ایک بار ابوظہبی کے پروگرام شامل ہیں —— اور اب یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ یہ پروگرام لاہور اور کراچی میں تو کئی کئی مساجد میں باقاعدہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملتان‘ جھنگ‘ فیصل آباد‘ اسلام آباد‘ پشاور اور جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ) میں بھی ہو رہا ہے —— گویا اب بحمداللہ دعوت رجوع الی القرآن کی یہ تحریک ملک گیر تو ہے ہی‘ اس کا چرچا بیرونِ ملک بھی موجود ہے۔

اور اس ''شجرۂ طیبہ'' کی ''اصلِ ثابت'' مطالعہ قرآن حکیم کا وہ منتخب نصاب ہی ہے۔ الحمد للہ کہ ایک آڈیو ریکارڈنگ مدراس (اب چنائی‘ بھارت) سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت لطیف اور شائستہ مزاج کے حامل انسان لطف اللہ خان صاحب نے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے گھر میں ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں کی تھی‘ جو ایک ایک گھنٹے کے چوالیس آڈیو کیسٹس پر مشتمل ہے‘ اور اہتمام یہ ہے کہ کیسٹ کی ایک سائڈ جو نصف گھنٹہ پر مشتمل ہوتی ہے‘ اس میں درس کا ایک حصہ 'خود مکتفی' انداز میں آجائے—— (برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ جناب لطف اللہ خان صاحب اگرچہ حصولِ معاش کے ضمن میں تو ایک ٹریولنگ ایجنسی چلاتے تھے‘ لیکن ان کی زبردست hobby یہ تھی کہ اردو کے تمام مشاہیر شعراء اور خطباء کو اصرار کر کے اپنے گھر بلا کر ان کا کلام ان کی اپنی آواز میں ریکارڈ کرتے تھے—— چنانچہ ان کے پاس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی voice library موجود ہے!)—— اس ریکارڈنگ کی ایک

خاص بات یہ ہے کہ چونکہ وہاں سامعین کوئی نہیں ہوتے تھے' لہٰذا ان میں عوامی خطابت کا انداز بالکل نہیں ہے' بلکہ سادہ ترین انداز میں اور اختصار کے ساتھ مطالب کا بیان ہے! ان کیسٹوں کو کافی عرصہ قبل ٹیپ سے اتار کر اور قدرے ایڈیٹنگ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا —— اور اب ہمارے ایک بزرگ رفیق اور کارکن نے ان کتابچوں کو تین جلدوں کی صورت میں شائع کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا ہے —— جس کی پہلی جلد جو منتخب نصاب کے کل چھ حصوں میں سے پہلے دو حصوں پر مشتمل ہے آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ میری خدمتِ قرآنی کو جو میری نسبت سے حقیر' لیکن قرآن کی نسبت سے بہت عظیم ہے' شرفِ قبول عطا فرمائے! —— اور خاص طور پر مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کو بڑے پیمانے پر دین کی اصل دعوت کی اشاعت کا ذریعہ بنا دے! آمین ثم آمین —— برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض ہے کہ اب میرا پورا دورۂ ترجمہ قرآن جو ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک میں کراچی میں اعلیٰ معیار پر ریکارڈ کیا گیا تھا' اور جس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ بڑے پیمانے پر پھیلے ہیں' اس کی بھی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو تعارفِ قرآن اور عظمت قرآن پر مفصل گفتگو کے علاوہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے ''بیان'' پر مشتمل ہے ——!

اس کے بعد ایک ہی کام باقی رہ جائے گا' اور وہ یہ کہ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا آخری درس جو میں نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہفتہ وار مجالس میں مکمل کیا تھا اور جس میں زیادہ مفصل تفسیری انداز ہے' چنانچہ وہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹوں کے 105 کیسٹوں پر مشتمل ہے' اسے ٹیپ سے اتار کر طباعت واشاعت کے کام کا ابھی آغاز بھی نہیں ہو سکا ہے' اور غالباً یہ کام میری وفات کے بعد ہی ہو سکے گا —— تاہم ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے' لہٰذا مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ فقط!

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

۲۱ / اکتوبر ۲۰۰۹ء

بیان القرآن —— ایک تعارف

پروفیسر عبدالجبار شاکر

محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل ''بیان القرآن'' حصہ اوّل کی تقریب رونمائی انجمن خدام القرآن سرحد کے زیر اہتمام ۱۸ جنوری ۲۰۰۹ء کو پرل کانٹی نینٹل پشاور میں ہوئی تھی۔ اس تقریب میں متعدد اہل علم حضرات شریک ہوئے اور ''بیان القرآن'' کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا۔ ان حضرات میں نیشنل سیرۃ سٹڈی سنٹر کے ڈائریکٹر پروفیسر عبدالجبار شاکر بھی تھے' جن کا مقالہ صفحاتِ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ تنظیم اسلامی اور انجمن ہائے خدام القرآن کے پروگراموں میں پروفیسر موصوف کی یہ آخری شرکت تھی۔ آپ ۱۳/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اسلام آباد میں بائی پاس آپریشن کے دوران انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین متین کی اشاعت وحمایت میں ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (ادارہ)

آج جس موضوع کی نسبت سے ہم سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں یہ ملتِ اسلامیہ کے افراد کی تربیت اور ان کی اجتماعی حیات کو منظّم کرنے والے اس نسخہ کیمیا کے سلسلۂ فہم کی ایک کڑی ہے جسے ''بیان القرآن'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات سننے کے لیے آج کی اس مبارک نشست کا انعقاد کیا گیا ہے۔ دُنیا میں انسان جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے اس کی عظیم ترین مخلوق ہے' جسے اس کائنات میں نیابتِ الٰہیہ کے فرائض تفویض کیے گئے ہیں اور خلیفة اللّٰه فی الارض کا منصب دیا گیا ہے' اور جس امانت کو اٹھانے سے اس کائنات کی تمام چیزوں نے انکار کر دیا' انسان نے اس امانت کو اُٹھانے کا ذمہ لیا۔ چنانچہ وہ امانت نظامِ وحی کے ذریعے سے انسانوں کو منتقل ہوئی ہے۔

یہ سلسلۂ وحی جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اللہ کے برگزیدہ بندوں کے ساتھ وابستہ رہا اور جس کی تفصیلات آج تاریخ کے دامن میں محفوظ اور موجود ہیں' وہ تین سو چودہ کے قریب

کتابیں اور صحائف ہیں جو انسان کے تزکیہ و تعلیم کے لیے اُتاری گئیں‘ لیکن آج انسانیت کا دامن ان کے حقیقی متن سے محروم ہے اور آخری وحی جسے آپ قرآن مجید کہتے ہیں‘ یہ انسانیت کی ابدی اور قیامت تک کی رہنمائی کے لیے اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ یہ وہ کتابِ مبین ہے جس نے اولاً حجاز و عرب کے اندر انقلاب پیدا کیا اور وہ مقاصد جو نبوت اور بعثت کے ساتھ وابستہ رکھے گئے تھے اور جو انسان کے تزکیہ و طہارت اور تعلیمِ کتاب و حکمت کے لیے مفید ہو سکتے تھے‘ اس کتاب کے ذریعے سے تکمیل پذیر ہوئے۔ یہی وہ کتابِ حیات ہے کہ جس کی درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں انسانیت کا سب سے بہترین معاشرہ وجود میں آیا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ مکی معاشرے سے مدنی معاشرے کے اختتام تک یہ وہ واحد کتاب تھی جس نے وحی کے متن کو محفوظ کیا‘ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔ ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (الحجر) ”ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں“۔

تاریخِ انسانی کا یہ سب سے بڑا مرحلہ کہ ایک کتاب نے آفاقی سطح پر زندگیوں کو تبدیل کیا اور وہ افراد و اَقوام کہ جن کی سیرت و کردار کے تذکروں سے قرآن مجید کی آیات معمور دکھائی دیتی ہیں‘ وہیں ان کی بدکرداری اور خصائص کا بھی تفصیل سے ذکر ہے۔ یہ چھٹی صدی عیسوی کا آخری اور ساتویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا جس میں دنیا کے نقشے پر ہدایت کے سارے سلسلے اور متون ماند پڑ چکے تھے اور انسانیت کسی ابدی ہدایت کی منتظر تھی۔ اس معاشرے میں ایک کتاب نے نہ صرف صالح اور نیکوکار افراد تیار کیے بلکہ ایک مہذب معاشرہ بھی تشکیل دیا اور انسانیت کے سامنے معاشرتی زندگی کا ایک اجتماعی نقشہ پیش کیا‘ بلکہ عملاً ایک ایسی ریاست کو وجود میں لایا گیا کہ ریاست کے جتنے ادارے ممکن ہو سکتے تھے‘ ان سب کے لیے ایک مثالی تعلیم اور ضوابط فراہم کیے اور بعد کے معاشروں میں اس کے لیے ایک صدائے بازگشت مسلسل اٹھتی رہی۔ اس کی نشاۃ ثانیہ ایک شدید پیاس‘ ایک مستقل آرزو اور ایک بے تاب تمنا ہے جو اب بھی اسلامی معاشروں اور دینی تحریکوں میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گی کہ اُسی ریاست کا احیاء یا اس کی نشاۃ ثانیہ کیسے کی جا سکتی ہے؟ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جن وسائل‘ جس وحی اور اسوۂ حسنہ کے ذریعے ایک انقلاب مکمل ہوا تھا‘ اِس انقلاب کا سرچشمہ ہمیشہ وہی رہے گا‘ البتہ اس سے فیض یابی کے مختلف ذرائع ہیں‘ ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید کے موضوعات و مضامین کے حوالے سے چودہ صدیوں میں عجیب و غریب

علمی اور تحقیقی کام ہوا ہے۔ آپ کو یہ تعداد بڑی مبالغہ آمیز معلوم ہوگی کہ مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے جو تراجم‘ تفاسیر یا حواشی لکھے گئے ہیں وہ ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہیں۔ لیکن یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید بلاشبہ حجاز میں اُترا‘ اور لحن کے اعتبار سے مصریوں نے اسے عروج تک پہنچایا‘ لیکن مسلم دانشوروں کا یہ کہنا ہے کہ قرآن مجید کے تفہیم اور تدبر کے مراحل جو برصغیر میں طے ہوئے ہیں‘ ایسا عظیم کام دنیا کے کسی دوسرے خطے میں نہیں ہوا۔ قرآن مجید کی خدمات کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان اور اس کے بعد قرآن فہمی کی جو شکلیں برصغیر میں پیدا ہوئی ہیں‘ وہ ایک بڑی تاریخی اور مثالی صورتِ حال ہے۔ گزشتہ صدی جسے آپ بیسویں صدی عیسوی کہتے ہیں‘ اس میں قرآن فہمی کے نئے سے نئے دبستان ہمارے سامنے آئے۔ اسے آپ خالص لسانی حوالے سے جاننے کی کوشش کریں‘ ادبی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کریں یا پھر جتنے جدید علوم وفنون دنیا میں پیدا ہوئے اُن کے حوالے سے قرآن مجید کے مطالعے اور تفہیم وتدبر کی کوشش کریں۔ مگر یہاں ایک بات الٹ ہوگئی کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنے علوم وفنون کا جائزہ علمِ وحی کی روشنی میں کرتے لیکن بدقسمتی سے بعض جگہ یہ ہوا کہ علمِ وحی کا مطالعہ جدید علوم کی روشنی میں کیا گیا‘ اس سے گمراہی اور انحراف کی ایک نئی روش پیدا ہوئی۔ دنیا کی بعض جامعات اور اداروں میں‘ خود عالم اسلام کے بعض مراکز میں اس انحراف کی شکلیں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

بیسویں صدی میں ایک نیا باب یہ کھلا کہ مسلمانوں کی اجتماعی حیات کے لیے ایسا نمونہ (Paradigm) جو اسلامی ریاست کے حوالے سے موجود تھا‘ اس کی ازِ سرنو تلاش شروع ہوئی۔ ہمارے ہاں استخلاصِ وطن اور آزادی کی تحریکیں چلیں‘ لیکن یہ آزادی چند خاص مقاصد کے لیے تھی۔ برصغیر میں استخلاصِ وطن اور آزادیٔ وطن کی جو تحریک چلی‘ اس میں قرآن فہمی ایک وسیلے اور آلۂ انقلاب کے طور پر استعمال ہوئی اور اس اعتبار سے قرآن کو اس زاویۂ نظر سے سمجھا اور سمجھایا جانے لگا کہ ہم ایک اسلامی معاشرے کا احیا کیسے کر سکتے ہیں؟ شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) کے فارسی ترجمہ قرآن اور ان کے صاحبزادوں شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے اردو تراجم قرآن نے قرآن فہمی کی ایک ایسی تحریک پیدا کردی جس کے اثرات نو بہ نو شکلوں میں آج تک موجود ہیں۔ بیسویں صدی میں جس قسم کا میکانکی معاشرہ دنیا میں وجود پذیر ہو چکا تھا اور انسانی فکر وفہم نے جو مراحل طے کر لیے تھے‘ اس کے باعث انسان

مادیت کے چُنگل میں جکڑا دکھائی دیتا ہے' اسے معاشی دائروں کے اندر قید کر دیا گیا ہے اور وہ اپنی ہی ایجادات کا نخچیر بن گیا ہے۔

قرآن مجید کی تفہیم میں علامہ اقبال کو ایک اعلیٰ اور منفرد مقام حاصل ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریروں اور ان کے بیانات وخطابات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاید زندگی کی ابتدا سے لے کر اب تک ان کی فکر کی تشکیل میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہے جس میں علامہ اقبال ان کے مرشد ورہنما نہ رہے ہوں' اور وہ ایک ایسا چراغ بن گئے جو تاریک راستوں کو روشنی سے منور کر دے۔ لاہور میں اس دور میں مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں ایک خاص حجرے میں کچھ تشنگانِ قرآن جمع ہوتے تھے اور اس میں قرآنی موضوعات پر بات چیت کرتے تھے۔ مدارسِ دینیہ میں بھی مختلف تفاسیر کو پڑھایا جاتا تھا لیکن یہ قرآن کی بہت محدود تعلیم تھی جس سے اذہان وقلوب میں وہ تغیر پیدا نہیں ہوتا تھا جو اس کا حقیقی مطلوب اور منتہیٰ ہے۔ صبح فجر کی نماز کے بعد بھی کچھ علماء درسِ قرآن دیا کرتے تھے اور یہ روایت ہزاروں مساجد میں کسی نہ کسی شکل میں آج تک قائم ہے' لیکن قرآن حکیم کی فکر' مضامین اور اس کے موضوعات کو ایک معاشرتی اور انقلابی انداز میں پیش کرنا' غالباً دروس کا یہ منہج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دروسِ قرآن میں شروع ہوا جس کے ذریعے معاشرے میں اسلامی انقلاب کی روح کو بیدار کرنا مقصود تھا۔ اگرچہ اس سے پیشتر بہت سے لوگ یہ فریضہ سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ان میں مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا بھی ایک اہم مقام ہے اور مولانا مودودی مرحوم کے دروس سے بھی ہم مستفیض ہوتے رہے' لیکن وہ مخصوص مقامات پر ایک خدمت ہو رہی تھی' جبکہ دروس قرآن کو ایک تحریکی شکل دینا' ایک موومنٹ بنا دینا' اور عوام الناس میں قرآن فہمی کا ایک جذبہ بیدار کر دینا' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک یادگاری اور تاریخی کارنامہ ہے۔

خود ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ مخلصانہ کاوشیں کہ انہوں نے اپنے منفعت بخش طبّی پیشے کو ترک کرتے ہوئے خالصتاً اپنے آپ کو قرآنی فکر سے جوڑ دیا اور اس کے بعد جو بھی کام کیا اس کی صرف اس ملک میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی پذیرائی ہو رہی ہے' اس کے اثرات کا یہ عالم ہے کہ آج کی دنیا میں سینکڑوں ایسے اسلامی سینٹرز موجود ہیں جو اس طرز پر کام کر رہے ہیں۔ قرآن مجید تو ایک زندہ کتاب ہے اور ہمیشہ رہے گی' لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایک چھوٹا سا کتابچہ قرآن فہمی کے لیے مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کو واضح کرتا ہے اور غالباً ان کی جن

تحریروں کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی‘ ان میں یہ کتابچہ سرفہرست ہے۔ پندرہویں صدی ہجری کے آغاز سے مسلمان ممالک میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص قرآن فہمی اور ترجمہ قرآن کے جتنے مراکز کام کر رہے ہیں‘ تاریخ اسلام کے پورے دورانیے میں ایسا کام بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ خواتین میں بھی ترجمہ قرآن اور تفسیر قرآن کے منظّم حلقے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآنی مطالب تک پہنچنے کے لیے بہت مفید اور آسان لٹریچر بھی تیار کیا جا رہا ہے اور شائع ہو رہا ہے۔

آج کی نشست اس عہد کے ممتاز خادمِ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد کے دروس قرآن کی ابتدائی دوسورتوں پر مشتمل تفسیری خدمات ''بیان القرآن'' حصہ اوّل کی افتتاحی تقریب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تذکارِ حیات سے شناسا احباب کو علم ہے کہ آپ زمانۂ طالب علمی ہی سے قرآن مجید کے ساتھ ایک خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ قرآن مجید سے محبت کا اوّلین سرچشمہ ان کے دل میں کلامِ اقبال کے مطالعے سے پیدا ہوا۔ علامہ اقبال کے قرآنی فکر سے متعلق چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی‘ نہ صاحب کشاف
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
حرفِ او را ریب نے‘ تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
خوار از مہجورئ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

برصغیر کی تقسیم کے بعد ڈاکٹر صاحب آگ اور خون کا دریا عبور کرتے ہوئے پاکستان میں داخل

ہوئے اور اپنے عہد کی فعال طلبہ تحریک ''اسلامی جمعیت طلبہ'' سے منسلک ہو گئے۔ بعد ازاں وہ جماعت اسلامی میں بھی کچھ وقت تک فعال کردار انجام دیتے رہے۔ جمعیت اور جماعت کے ساتھ تعلق کے اس دورانیے میں وہ اپنے دروسِ قرآن کے لیے بہت معروف تھے۔ ایک خاص زمانے میں بہت سے اکابر جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے اپنی اس علیحدگی کی وجوہ کو ''تعبیر کی غلطی'' پر محمول کیا' لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ ''تعبیر کی کوتاہی'' تھی۔ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی سے تو الگ ہو گئے مگر جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی فکر ان سے ہمیشہ دامن گیر رہی' جس کے نتیجے میں انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' لاہور تشکیل دی اور خدمت قرآن بذریعہ دروسِ قرآن کا سلسلہ اس انجمن کی تابانی اور درخشانی کا موجب بنا۔ ۱۹۷۶ء میں انہوں نے قرآن اکیڈمی قائم کی جس میں زیادہ وسعت اور جذبے کے ساتھ تعلیماتِ قرآنی کے فروغ کا اہتمام کیا گیا۔ لاہور میں ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں انہوں نے قرآن اکیڈمی کی موزوں عمارتیں تعمیر کیں اور اس کے ساتھ ایک مسجد کا بھی اضافہ کیا۔

یہ ۱۹۸۴ء کا زمانہ تھا جب ڈاکٹر صاحب نے قرآن اکیڈمی لاہور میں نماز تراویح کے ساتھ ایک مخصوص اسلوب میں قرآنی موضوعات اور مطالب کو بھی پیش کیا' جسے دورۂ ترجمۂ قرآن کا نام دیا گیا۔ رمضان اور قرآن کے لزوم اور امتزاج نے اس پروگرام کو ایک خاص روحانی رنگ عطا کیا۔ راقم الحروف ان دنوں لاہور ہی میں نظامت کتب خانہ جات پنجاب میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب سے دیرینہ قلبی تعلق کے پیش نظر ان کی قرآنی خدمات کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ تھا۔ قرآن اکیڈمی کی مسجد کا وسیع اور کشادہ ہال قرآنی اجتماعات کے لیے وقف رہا۔ یوں قرآنی مطالب اور مفاہیم کی موجِ سلسبیل اپنی فیض رسانیوں کے باعث ملک اور بیرون ملک میں قرآنی حلقوں کو سیراب کرتی رہی اور یوں قرآن مجید کے طلبہ اپنی تشنہ کامی کا مداوا کرتے رہے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو پاکستان ٹیلی ویژن پر اپنے دروسِ قرآن پیش کرنے کے مواقع حاصل ہوئے تو سمع وبصر کی دنیا کے ذریعے قرآن مجید کی آواز ہر گھر میں ایک گونج اور ارتعاش پیدا کرنے لگی' مگر نامعلوم اسباب کے باعث کچھ عرصے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا' جس سے قرآنی مطالب کی ترسیل کا یہ اجتماعی نظام مختل اور متاثر ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے دورۂ ترجمۂ قرآن کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ سلسلہ جلد ہی

نہ صرف ملک بھر میں بلکہ بیرون ملک بھی پھیل گیا۔ عروس البلاد کراچی‘ اپنے نام کی حد تک تو ایک شہر ہے مگر اپنے قد وقامت‘ آبادی اور وسائل کے لحاظ سے کئی ملکوں پر بھاری ہے۔ یہاں بھی قرآن اکیڈمی قائم ہوئی‘ جس کی وسیع وعریض جامع مسجد میں ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ اس دورۂ ترجمہ قرآن کو الیکٹرانک آلات کی مدد سے متنوع شکلوں میں محفوظ کرلیا گیا‘ جس سے ان دنوں ہر جگہ استفادہ کیا جا رہا ہے۔ پیش نظر تفسیری کاوش ''بیان القرآن'' کا حصہ اوّل انہی الیکٹرانک آلات سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے‘ جسے حافظ خالد محمود خضر صاحب نے بہت توجہ اور ریاضت سے مرتب کیا ہے۔ اس میں چند املائی تسامحات ان شاء اللہ اشاعتِ ثانی میں دُور ہو جائیں گی۔ اس تفسیر کی ابتداء میں ڈاکٹر صاحب نے تعارفِ قرآن اور عظمتِ قرآن کے عنوان سے تقریباً پونے دوصد صفحات میں جن مباحث کو پیش کیا ہے‘ اس تفسیر کا مطالعہ کرنے سے پہلے ان کا سنجیدگی سے مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے بعد سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی مکمل تفسیر ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش نظر رہے کہ یہ تفسیر اپنے روایتی اسلوب میں نہیں لکھی گئی بلکہ یہ ان کے دروس کو تحریری قالب میں ڈھالا گیا ہے‘ یہی باعث ہے کہ اس کا انداز اور اسلوب خطابیہ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ خود قرآن مجید کا اسلوب بھی خطابیہ ہے۔ اس تشابہ نے اس تفسیری خدمت میں تفہیم کا اصلی رنگ اختیار کرلیا ہے۔ روایتی تفسیر کی بجائے آیات کے مسلسل موضوعاتی گروپ کو سامنے رکھتے ہوئے مطالب پیش کیے گئے ہیں۔ قدیم تفاسیر سے استفادے کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے عصری تداول کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ یوں یہ تفسیر محض ماضی کے عبرت آموز وقائع بیان کرنے کی بجائے حال کی تعمیر اور خرابیوں کے علاج پر بھی توجہ دلاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اندازِ تفسیر یا درسی منہج یہ ہے کہ وہ پہلے چند آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور پھر ان آیات کے موضوع کا پس منظر‘ شانِ نزول اور عمود بیان کرنے کے بعد ہر آیت کے مطالب کو پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ آیات کی تفسیر میں وہ علومِ جدیدہ کے حوالوں سے بھی بات کرتے ہیں اور اکثر موزوں فارسی اور اردو اشعار سے اپنے سامعین کے لیے مضمون کی تاثیر کو دوبالا کرتے ہیں۔ ایسا اسلوب ایک خطابیہ انداز کا حامل ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو گزشتہ چالیس سال میں سینکڑوں مواقع پر سننے اور گاہے بگاہے ان کے محاضرات میں اپنی معروضات کو پیش کرنے کے مواقع بھی نصیب ہوئے۔ مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی

تذبذب نہیں کہ وہ دورِ حاضر کے ایک کامیاب مقرر ہیں‘ ان کا انداز گفتگو بہت جاذب (receptive) ہے‘ وہ اپنے سامع کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں‘ گاہے بگاہے اس کے تجسس کو ابھارتے ہیں‘ اس کی تشکیک کی تشخیص کرتے ہیں اور اپنے بیان میں اس کا علاج بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ علومِ جدیدہ کے ساتھ گہری اور مسلسل وابستگی نے ان کے ہاں جو علمی تناظر یا Paradigm پیدا کیا ہے‘ وہ عصرِ حاضر میں قرآن فہمی کے لیے ناگزیر اور نوجوان نسل کو قرآن سے قریب تر رکھنے میں اکسیر ہے۔ ڈاکٹر صاحب خدمتِ قرآن کے جس میدان میں آج سے چالیس سال قبل اترے تھے‘ وہ اب ایک کارواں در کارواں کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مختلف مسالک‘ تحریکوں‘ تنظیموں اور افراد نے اس سلسلۃ الذہب کو متنوع اسالیب میں پیش کرنے کا داعیہ اختیار کر رکھا ہے اور ہم اپنے معاشرے میں اس کے اثر و نفوذ کو محسوس کر سکتے ہیں۔

’’بیان القرآن‘‘ کوئی فقہی تفسیر نہیں ہے اور نہ ہی اسے کسی مخصوص اصولِ تفسیر کی روشنی میں قلم بند کیا گیا ہے بلکہ اس میں مطالب‘ مفاہیم‘ مضامین اور موضوعات کو اس طریق پر پیش کیا گیا ہے کہ ہم قرآنی فکر سے آگاہی کے بعد اس تبدیلی اور تغیر کو برپا کر سکیں جو پہلے ایک فرد کے اپنے سینۂ سرد میں ایک شعلۂ سوزاں بن کر حرکت و حرارت پیدا کرتا ہے اور پھر شعلۂ جوّالا بن کر اپنے چارسو کو بدل دینے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ قرآن مجید کو بطور آلۂ انقلاب متعارف کرانے کی جو متنوع علمی کوششیں بیسویں صدی میں پیدا ہوئیں‘ ’’بیان القرآن‘‘ کی یہ کاوش بھی ایک جداگانہ آہنگ کے ساتھ اسی کا تسلسل ہے۔ اس کا مقصدِ اوّل قدم پر ایک فرد کے قلب و نظر میں تبدیلی پیدا کرنا ہے‘ پھر اس سے معاشرتی سطح پر اصلاح کا کام لینا ہے اور اپنے آخری ہدف کے بطور ایک عالمی فکری انقلاب پیدا کرنا ہے جو قرآن مجید کا حقیقی مقصود ہے‘ جسے قرآن مجید میں تین مقامات پر ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور اسی کی خاطر اُمتِ مسلمہ کو سورۂ آل عمران میں ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

’’بیان القرآن‘‘ کے اس تفسیری سلسلے کو قائم رہنا چاہیے‘ اس کی ایڈیٹنگ کے آخر میں محترم ڈاکٹر صاحب کو نظرثانی کی غرض سے ایک بھرپور نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو ایسی بابرکت عمر اور عمدہ صحت عطا فرمائے کہ وہ ’’بیان القرآن‘‘ کے اس سلسلے کو مِسک الختام تک پہنچا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تفسیری کاوش ان شاء اللہ قبولیتِ عامہ حاصل کرے گی۔ oo

مسلمانوں کے

قرآن مجید سے بُعد اور بیگانگی کے اسباب

از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

یہ فکر انگیز مقالہ چشتی صاحب مرحوم نے ۱۹۷۶ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی تیسری سالانہ کانفرنس کے موقع پر پیش فرمایا تھا۔

آریائی ذہن تصوراتی (speculative) اور سامی ذہن عملی (practical) ہے۔ یونان' ایران اور ہندوستان' تینوں ملک فلسفہ وحکمت کا منبع تھے' لیکن اللہ کی حکمتِ بالغہ نے اپنے آخری اور کامل پیغامِ ہدایت کے لیے عرب کی زمین کو منتخب کیا جو منطق' فلسفہ اور حکمت کے اثرات سے پاک تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن درسِ فلسفہ پر عملِ صالح اور جہاد کو ترجیح دیتا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن حکمت کا منکر یا اس کا دشمن نہیں ہے' بات صرف اتنی ہے کہ وہ بقولِ اقبال تصورات کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور دیتا ہے (emphasises deed rather than ideas) قرآن صرف ایک اخلاقی نظام نہیں بلکہ وہ کامل دستورِ حیات ہے اور اسے نافذ کرنے کے لیے متکلمین کے بجائے مجاہدین کی ضرورت ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ منطق' فلسفہ اور کلام میں انہماک سے انسان کی عملی قوت (جو شرطِ جہاد ہے) بالکل افسردہ اور مردہ ہو جاتی ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

(۱) ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾

(الصف)

''اللہ چاہتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں صف باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔''

(۲) ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ

فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

''اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔''

مگر کسی منطقی یا فلسفی نے آج تک جان اللہ کے ہاتھ نہیں بیچی۔ اس لیے اللہ نے اپنے آخری پیغام کے لیے ایسی قوم کو منتخب کیا جو منطق' فلسفہ اور کلام تینوں علوم ''آلیہ'' سے بیگانہ تھی۔ اس لیے کہ اللہ کو اپنے کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے مجاہد درکار تھے نہ کہ منطقی۔ وہ ایسے آدمی چاہتا تھا جو ''سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا '' کا مصداق ہوں تا کہ وہ اللہ کے قانون کو بلا چون و چرا نافذ کر سکیں اور جب کوئی ان سے پوچھے کہ میاں تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو؟ کیا مقصد ہے؟ تو وہ یہ جواب دیں جو قیامت تک یادگار رہے گا: ہم خود نہیں آئے ہیں بلکہ: ''اِنَّ اللّٰہَ اَرسلنا لِنُخرِجَ النَّاسَ مِن ظُلماتِ الجھالۃِ وجَورِ المُلوکِ الٰی نورِ الایمانِ وَعدلِ الاِسلام'' (ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تا کہ ہم لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں اور بادشاہوں کے ظلم سے نکال کر ایمان کی روشنی اور اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لے آئیں۔)

قصہ مختصر' قرآن نے ان سے کہا:

(۱) تمہاری دنیا کی زندگی دراصل دھوکے کی پونجی ہے۔ یہ حقیقی (real) نہیں ہے۔ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہوگی' لہٰذا اس کے حصول کے لیے کوشش کرو۔

﴿اِنَّ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ لَہِیَ الۡحَیَوَانُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۴﴾﴾ (العنکبوت)

(۲) یہ زندگی ان کو ملے گی جو دینِ حق کی نشر و اشاعت میں اپنی جان کھپائیں گے اور اپنی دولت خرچ کریں گے اور اللہ کو اپنا محبوب بنائیں گے۔

الغرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ۲۳ سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بحث نہیں کی' نہ منطقی' نہ کلامی' نہ سائنسی' نہ فلسفیانہ۔ مثلاً: (۱) نہ بحثِ ذات وصفات (۲) نہ بحثِ خیر وشر (۳) نہ بحث جبر واختیار (۴) نہ بحثِ حدوث وقدمِ عالم (۵) نہ بحث حشرِ اجساد (۶) نہ بحثِ وزنِ اعمال (۷) نہ کیفیتِ رؤیتِ باری تعالیٰ (۸) نہ کیفیتِ جنت ودوزخ (۹) نہ کیفیتِ وحی (۱۰) نہ ماہیتِ نفس ناطقہ (۱۱) نہ ماہیت روح (۱۲) اور نہ چگونگی اتصال نفسِ ناطقہ با جسم انسانی یا کیفیتِ انفصالِ نفس ناطقہ از جسم۔

یہی بارہ بنیادی سوال ہیں جو تین ہزار سال سے استخوانِ نزاع بنے ہوئے ہیں اور

قیامت تک بنے رہیں گے، کیونکہ ؎

انکشافِ رازِ ہستی عقل سے ممکن نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے!

اسی لیے حافظ شیرازی نے ہمیں مشورہ دیا تھا: ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

قرآن حکیم نے اپنی تعلیمات کی بنا پر ساری دنیا سے جنگ مول لے لی۔

(۱) سب سے پہلے مشرکوں کو ختم کیا (۲) پھر یہود کو زیر کیا، بلکہ ختم کر دیا (۳) پھر نصاریٰ کو محکوم بنایا اور دونوں کو خارج البلد کر دیا (۴) پھر عراق اور ایران کو فتح کیا، اور مجوسیت، مزدکیت اور مانویت کو ختم کر دیا (۵) پھر شام اور ارضِ روم اور ایشیائے کوچک کو فتح کیا اور نصرانیت اور انسان پرستی کو ختم کیا۔ گویا حسب ذیل اقوام کو اپنا جانی دشمن بنالیا:

(۱) بت پرست (۲) ستارہ پرست (۳) آفتاب پرست (۴) انسان پرست (۵) مجوسی (۶) مزدکی (۷) مانوی (۸) یہودی (۹) عیسائی ...... دوسرے لفظوں میں اسلام نے پہلی صدی ہجری ہی میں ساری دنیا کو اپنا دشمن بنالیا۔

---

(۱) انتقامِ یہود

یہودی قوم نے انتقام میں سبقت کی۔ ۳۰ھ میں عبداللہ بن سبا یہودی منافقانہ طور پر اسلام لایا اور اس نے مسلمانوں کو خدا پرستی کے بجائے شخص (انسان) پرستی کی تعلیم دی۔ اس طرح اسلام میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا جس نے قرآن کے بجائے ایک خاندان کو، اور اللہ کے بجائے ایک شخص کو اپنا محبوب اور مطلوب بنالیا۔ اس طرح ایک فرقہ بندی بھی پیدا کر دی جس سے اللہ نے اجتناب کا حکم دیا تھا، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝﴾ (الروم)

''اور مت ہو شرک کرنے والوں میں۔ جنہوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہو گئے ان میں بہت فرقے، ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر فریفتہ ہے۔''

مزید برآں اس فرقے کی توجہ قرآن سے ہٹ کر چند افراد پر مبذول ہوگئی اور اُس نے جہاد کے بجائے رنج وغم کو اپنا شعارِ حیات اور امتیازی نشان بنا لیا۔ حالانکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ رنج وغم تین دن سے زیادہ مت کرو‘ مگر ہم (یعنی نہ صرف وہ فرقہ بلکہ اُمت کے سوادِ اعظم کی بھی بڑی تعداد) اس کارِ خیر میں مصروف ہیں اور اللہ کے فضل سے ہر سال اس کی کمیت اور کیفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

(۲) انتقامِ ایران

یہود کی کامیابی کے بعد ایران نے انتقام کا سلسلہ شروع کیا۔ طرفہ قیامت یہ ہوگئی کہ جوں جوں ایرانی انتقام میں شدید ہوتے چلے گئے مسلمان اندرونی خلفشار کی وجہ سے‘ جو عبداللہ ابن سبا نے پیدا کر دیا تھا‘ تمسک بالقرآن میں ضعیف ہوتے چلے گئے۔

یہود نے انتقام اس طرح لیا کہ مسلمانوں کی توجہ قرآن کے بجائے چند اشخاص کی طرف مبذول کر دی اور ایرانیوں نے اس طرح کہ مسلمانوں کی توجہ قرآن کے بجائے فلسفیانہ اور کلامی مسائل کی طرف منعطف کر دی۔ چونکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایران فتح کیا اس لیے ایرانیوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے دشمنی اور دشنام کو اپنا قومی شعار بنا لیا اور ہنوز یہی جذبات کارفرما ہیں۔ چنانچہ ایک ایرانی شاعر فردوسی نے اپنے معاندانہ جذبات کا اظہار ایرانی قوم کی زبان سے یوں کیا ہے: ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیدست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

سچ کہا ہے کسی نے ؏ ”با آلِ عمرؓ کینہ قدیم است عجم را!“

قصہ مختصر‘ مسلمان عجم میں آ کر فلسفیانہ مسائل میں ایسے منہمک ہوئے اور پھر ایسے الجھے کہ ابھی تک نجات نہیں پا سکے اور میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ صورِ اسرافیل تک الجھے رہیں گے۔ کیونکہ کہاں مباحثے اور مجادلے کی لذت و راحت اور کہاں میدانِ جنگ کی صعوبت و کلفت!

یاد رکھو! منطق‘ فلسفہ اور کلام میں انہماک کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قوم جہاد اور قتال سے بیگانہ محض ہو جاتی ہے۔ اس کا ثبوت درکار ہو تو تاریخ ہند کا مطالعہ کافی ہوگا۔ صرف ایک

مثال درج کیے دیتا ہوں۔ جب گیارہویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) میں محمود غزنوی نے ہندوستان کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندنا شروع کیا تو یہ زمانہ ہندوستان میں منطق‘ فلسفہ اور کلام کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس موقع پر اگر میں اس عروج کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو اپنے موضوع سے بالکل منقطع ہو جاؤں گا‘ اس لیے اس وقت صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اُس زمانے میں ہندوستان جنت نشان میں صرف فلسفے کے چالیس مختلف النوع مدارسِ فکر (بیس سے زائد صرف ہندومت میں اور اٹھارہ بدھ مت‘ جین مت اور چارواک میں) موجود تھے جو رات دن مناظروں اور مباحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ نتیجہ اس **اشتغال بالفلسفه والمنطق** کا یہ نکلا کہ پوری قوم جنگی اسپرٹ سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ منطق اور فلسفے نے ہندوؤں کے قوائے عملیہ کو ضعیف کر دیا تھا اور وہ کسی جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ جس طرح چوتھی صدی ہجری میں بغداد کے مسلمانوں نے اسماعیلیوں کو تین لاکھ اشرفیاں پیش کی تھیں کہ حجرِ اسود واپس کر دو‘ اسی طرح پانچویں صدی میں سومنات کے ہندوؤں نے محمود کو دس لاکھ اشرفیاں پیش کی تھیں کہ بت کو مت توڑو۔ محمود نے کہا: ”میں بت فروش بننے کے بجائے بت شکن بننا پسند کرتا ہوں‘ میں نہیں چاہتا کہ تاریخ میں میرا نام محمود بت فروش درج کیا جائے“۔

گویا یہود کی طرح ایران نے بھی انتقام لے لیا‘ یعنی مسلمانوں کو رفتہ رفتہ قرآن سے بعد ہوتا چلا گیا اور نتیجتاً جہاد کا تصور دماغ سے محو ہوتا چلا گیا۔ جہاد بالسیف سے بیگانگی کا نتیجہ ۱۲۵۸ء میں ظہور پذیر ہوا جب ہلاکو نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے مشہور سبائی مشیرِ خاص نصیر الدین طوسی کے مشورے اور رسوائے زمانہ سبائی وزیراعظم ابن علقمی کے ایما سے بغداد کو فتح کر کے دریائے دجلہ کو پندرہ لاکھ منطقی‘ فلسفی‘ متکلم‘ شاعر‘ موسیقار‘ منجم ومہندس مسلمانانِ بغداد کے خونِ بےحمیت و بےغیرت سے سرخ کر دیا۔ اور سعدی شیرازی نے اپنی آنکھوں سے خونباری کے بعد آسمان کے لیے بھی جواز پیدا کر دیا۔ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلک مستعصم امیر المؤمنیں

اگر مسلمان جہاد کی لذت سے بیگانہ نہ ہو گئے ہوتے تو ایک نہیں دس ہلاکو بھی بغداد کو فتح نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب سلاطین عباسی کے محلوں میں جارجیہ اور سرکاشیہ کی حسین ترین لڑکیاں ہزاروں کی تعداد میں جمع تھیں تو ایسے عالمِ ہوش ربا میں جہاد کا خیال کس کافر کے دماغ

میں آ سکتا تھا؟ بقول اکبرالہ آبادی: ؎

فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر! یہ خوب کہی!

ایرانیوں نے کمال چابکدستی سے اسلام کے ظاہری ڈھانچے کو تو قائم رکھا مگر اس میں سے روح نکال دی۔ یعنی مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کر دیا اور قرآنی تعلیم کی جگہ اسلام کا ایک نیا ایڈیشن مرتب کر دیا، جس میں سب کچھ تھا مگر جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر نہ تھا۔ سچ کہا اکبر نے ؎

بہت ہی کم پائے اپنے عارف، کلامِ باری نے ہم میں آ کر
سرے سے بگڑا ہے سچ جو پوچھو عرب کا مذہب عجم میں آ کر

(۳) تصوف میں غیر اسلامی عقائد کی آمیزش

قرآن سے بُعد و بیگانگی کی تیسری وجہ یہ ہوئی کہ ایران میں آ کر جس طرح اسلام میں شرک اور شخصیت پرستی کے ناپاک عناصر داخل ہو گئے اسی طرح تصوف میں غیر اسلامی عقائد داخل ہو گئے، اور وہ تصوف جو عبارت تھا جہاد و مجاہدہ سے وہ بالکل ''ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ تُرک'' یعنی سراسر Renunciation اور رہبانیت بن گیا اور مساجد ویران اور خانقاہیں معمور ہوتی چلی گئیں۔ اور یہ ایرانیوں نے انتقام کی تیسری شکل اختیار کی کہ مجاہدوں کو گوشہ نشین بنا دیا۔ ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے ؎

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند گریبانِ شہنشاہاں دریدند!
چو آں آتش درونِ سینہ افسرد مسلماناں بدرگاہاں خزیدند!

چنانچہ قرآن سے بے تعلقی کا ایک اہم سبب یہ خانقاہیں بن گئیں۔ دراصل ان کا واضح اور معین مقصد تو یہ نہیں تھا کہ مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو جائیں مگر شام، عراق، ایران، ترکستان اور ہندوستان ان سب ممالک میں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ان خانقاہوں کی چار دیواری سے قرآن آہستہ آہستہ خارج ہوتا چلا گیا۔

جو خدا کا نام لے سکتے تھے وہ رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!
(بہ تبدیلی الفاظ)

بے شک سلطان الہند نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے خلیفہ حضرت چراغ دہلیؒ کی خانقاہوں میں قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسولﷺ کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں مگر پندرہویں صدی سے قرآن ان خانقاہوں سے یعنی صوفیوں کے نصابِ تعلیم سے خارج ہوگیا اور صوفیوں کا مقصدِ حیات صرف ذکر اور مراقبہ بن گیا۔

یہاں ایک اہم نکتے کی وضاحت کر دوں، میرے اس قول سے کہ ''صوفیوں کا مقصدِ حیات صرف ذکر و مراقبہ تھا'' کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ذکر و مراقبے کی افادیت اور اہمیت کا منکر ہوں۔ یہاں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عموماً صوفیاء ساری عمر ذکر اور مراقبے میں بسر کر دیتے ہیں حالانکہ ذکر و مراقبہ مقصود بالذات ہرگز نہیں ہے بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ یہ اس لیے کرایا جاتا ہے کہ سالک کے نفس کا تزکیہ ہو جائے اور وہ سلطانِ جائر کے سامنے کلمہ حق کہہ سکے۔ لیکن ایک عرصۂ دراز سے ذکر اور مراقبہ ہی مقصود بالذات بن چکا ہے۔ اب کوئی کلمہ حق کہنے والا ان خانقاہوں سے (جو پاکستان میں شاد اور آباد ہیں) میدان میں نہیں آتا۔ اسی لیے تو اقبال نے کہا: ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

اس شعر میں تلمیح ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی طرف کہ ساقی کا فیض غیر مشروط نہیں ہے، وہ راستہ ضرور دکھاتے ہیں مگر انہی کو جو ان کے لیے مجاہدہ کریں۔ افرنگی صوفوں پر بیٹھنے والے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ یہ قانونِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:٦٩)

''اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سجھا دیں گے اُن کو اپنی راہیں۔''

چنانچہ خود اقبال ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ؎

ایں چنیں دل خود نگر ، اللہ مست
جز بدرویشی نہ مے آید بدست!

(۴)اشتغال بالحدیث

قرآن سے بےتعلقی کی چوتھی وجہ اشتغال بالحدیث ثابت ہوا' اوراس میں غیر معمولی انہماک کی وجہ یہ ہوئی کہ سبائیوں' زندیقوں' منافقوں اور ایرانیوں نے محض انتقام لینے کے جذبے سے سرشار ہوکر لاکھوں جھوٹی حدیثیں وضع کر کے مسلمانوں میں شائع بھی کر دیں اور کتابوں میں درج بھی کر دیں' اورمنافقانہ طور پر مسلمان بن کر اسلامی مدارس میں ان احادیث کا درس بھی دیا اور انہیں سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں میں اس طرح پیوست کر دیا کہ وہ ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود ہنوز جزوِایمان وعقائد بنی ہوئی ہیں۔ اگر ان کی مثالیں دوں تو پھر اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ سامعین بطور خود ''موضوعاتِ کبیر'' مصنفہ ملاعلی قاریؒ کا مطالعہ کریں۔ پانچ سو جھوٹی حدیثیں تو مجھے بھی معلوم ہیں۔ اسی لیے ایک ایک روایت کی تحقیق کے لیے مسلمانوں کو ہزاروں میل کا سفر طے کرنا پڑا اور جب امام اسمٰعیل بخاریؒ نے مشہورِ عالم مجموعہ احادیث مرتب اور مدون کیا تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف تین ہزار قبول کیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حدیثوں کی چھان پھٹک میں مسلمان اس قدر منہمک ہو گئے کہ قرآن کی طرف وہ توجہ مبذول نہ کر سکے جس کا وہ مستحق تھا اور وہ پس منظر میں چلا گیا۔

(۵)اشتغال بالفقہ

قرآن سے بُعد و بیگانگی کی پانچویں وجہ یہ ہوئی کہ حکومت میں عہدہ حاصل کرنے یا مجسٹریٹ اور جج بننے کے لیے صرف فقہ کی ضرورت تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی توجہ قدرتی طور پر تحصیلِ فقہ کی طرف مبذول ہوگئی اور قرآن بیک گراؤنڈ میں چلا گیا۔ اس لیے کہ جب صرف فقہ پڑھ کر عزت اور حکومت مل سکتی ہے تو کوئی قرآن کیوں پڑھے؟

(٦)ملوکیت کا اثر

قرآن سے بیگانگی کی چھٹی وجہ یہ ہوئی کہ جب مسلمانوں میں ملوکیت مستحکم ہوگئی تو ملوک اور سلاطین نے علماء کو مشورے کے رنگ میں حکم دیا یا حکم کے رنگ میں مشورہ دیا کہ مسلمانوں کی توجہ حدیث اور فقہ پر مبذول کر دو' اپنے حلقہ درس میں قرآن کی تعلیم عام مت کرو' کیونکہ اس کی زد بہرحال ملوکیت پر پڑے گی ؎

زیر گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسوی اللہ کافری است

اور

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

ظاہر ہے کہ ہارون اور مامون سے لے کر شاہجہاں اور عالمگیر تک سب کی نفی ہو جائے گی اور یہ لوگ بقول اقبالؔ بت بن جائیں گے۔ مسلمان حکمرانوں کو نہ اس کی ضرورت تھی نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ عوام قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہو کر کوئی انقلاب برپا کریں اور اس طرح ان کے عیش میں خلل پڑے۔ رہے علماء اور صوفیاء تو وہ خود قرآن سے بے تعلق تھے یا غیر جانبدار کہہ لو۔ نہ اقرار می کنم و نہ انکار می کنم۔ علماء کا مبلغ علم فقہ تھا اور صوفیاء کا منتہائے پرواز بلکہ مقصدِ حیات ذکر و مراقبہ تو وہ قرآن کا ترجمہ کیوں کرتے؟ تو جب سلاطین' نوابوں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا فائدہ اس میں تھا کہ عوام قرآن سے بیگانہ رہیں تو علماء اور صوفیاء پاگل تھے جو سلاطین سے ٹکر لیتے؟ اور اپنے وظیفے بند اور جاگیریں ضبط کراتے؟ نہ ہر عالم دین امام ابن تیمیہؒ ہو سکتا ہے اور نہ ہر صوفئ صافی امامِ ربانی مجدد الف ثانیؒ ہو سکتا ہے ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار!

(۷) درسِ نظامی میں قرآن سے اعراض

قرآن سے مسلمانوں کی بیگانگی کی ساتویں وجہ یہ ہوئی کہ جب اورنگزیب کے عہد میں ملا نظام الدین سہالوی نے مشہورِ عالم درسِ نظامیہ مدون کیا (جو گزشتہ تین سو سال سے بجنسہٖ و بعینہٖ ہمارے عربی مدارس پر حکمران ہے) تو اس میں منطق کی تو پندرہ[1] کتابیں رکھیں لیکن قرآن کے صرف ڈھائی پارے اور وہ بھی بطورِ تبرک۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عربی مدارس کے طلبہ کے دماغوں میں' جو آگے چل کر علماء بنتے ہیں' قرآن کی کوئی اہمیت سرے سے جاگزیں نہیں ہو پاتی اور وہ قرآن سے متعلق کسی موضوع پر نہ تقریر کر سکتے ہیں اور نہ چار سطریں لکھ سکتے ہیں' الا ماشاء اللہ!

(نوٹ: تقلید کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علماء جو آج ۱۹۷۶ء میں مصروفِ درس و تدریس ہیں' وہ اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ اس نصاب میں جو ۱۶۸۶ء میں مدوّن ہوا تھا' کوئی

(۱) صغریٰ' کبریٰ' قال اقول' میزان المنطق' بدیع المیزان' تہذیب' شرح تہذیب' مرقاۃ قطبی' میر قطبی' سلم العلوم' ملاحسن' ملا مبین' قاضی مبارک' حمد اللہ (اور میرے بچپن میں غلام یحییٰ بھی داخل درس تھا)

مال وزر کی بنا پر اپنے مقصدِ مشئوم میں کامیاب ہو گئے اور مسلمان قرآن سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

(۱۰) حکومت اور دولت کا حصول

قرآن سے بیگانگی کی دسویں اور آخری وجہ یہ ہوئی کہ جب عوام اور خواص‘ حکومت اور اس کے نتیجے میں دولت سے مستفید ہوئے تو وہ تمام عیوب ان میں پیدا ہو گئے جو حکومت اور دولت کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ عیوب مثلاً عقیدے کی خرابی بلکہ خرابیاں‘ غیر اسلامی رسوم پر عمل اور انہیں داخل اسلام سمجھنا اور خلافِ قرآن زندگی بسر کرنا‘ یہ چیزیں اس قدر محبوب ہو گئیں کہ مسلمانوں کا مذہب بن گئیں (تفصیل میں مصلحتاً جانا نہیں چاہتا کیونکہ تفصیل میں بعض عناصر کی نشاندہی کرنی پڑے گی اور یہ بات خلافِ مصلحت ہے)۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست!

اب قرآن تو ان سب باتوں کا دشمن ہے‘ مثلاً قرآن کہتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿١٣﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ﴾ (فاطر:١٤)

’’اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ مالک نہیں کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے۔ اگر تم ان کو پکارو سنیں نہیں تمہاری پکار‘ اور سنیں تو پہنچ نہ سکیں تمہارے کام پر‘ اور قیامت کے دن منکر ہوں گے تمہارے شریک ٹھہرانے سے۔‘‘

’’قِطمیر‘‘ وہ سفیدی ہے جو کھجور کی گٹھلی کے سرے پر پائی جاتی ہے اور اس سے کم تر اور بے قیمت چیز عربوں کے یہاں موجود نہیں تھی۔

یہ صرف ایک آیت ہے‘ قرآن میں اسی مضمون کی سینکڑوں آیات ہیں۔ تو ان طبقات نے جو سلاطین‘ امراء‘ علماءِ سوء اور صوفیاءِ سوء پر مشتمل تھا ایسی کوشش کی کہ عوام اور خواص دونوں قرآن سے بیگانہ ہو جائیں تاکہ ہماری غیر قرآنی زندگی اور عقائد و رسوم اور طرزِ حیات پر گرفت نہ کر سکیں‘ بلکہ شرک اور اولیاء پرستی اور قبور پرستی اور آثار پرستی‘ سب کو عین اسلام سمجھیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام اور خواص قرآن سے بیگانہ ہو جائیں۔ چنانچہ چاروں طبقات کی ملی بھگت سے مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو گئے۔

تبدیلی کر سکیں۔ اسی لیے عام طور پر نئے فاضلینِ درس نظامی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تبوک مدینے سے کتنے میل دور ہے؟ اور ہے کہاں؟ جنگ یرموک کب واقع ہوئی تھی؟ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کس سن میں ہوا تھا؟ وَقِس علی ھٰذا!

(۸) عربی زبان سے عدم توجہی

قرآن سے بیگانگی کی آٹھویں وجہ یہ ہے کہ نہ صرف ایران بلکہ عالم اسلام کے تمام مشرقی ممالک میں دفتری زبان فارسی ہوگئی اور عربی کی حیثیت صرف ثانوی رہ گئی۔ چنانچہ جب صرف ''کنز'' اور ''قدوری'' پڑھ کر ایک مسلمان کو سرکاری عہدہ مل سکتا تھا تو وہ قرآن پر عرق ریزی کیوں کرتا؟

(۹) جاگیرداری کا اثر ورسوخ

قرآن سے دوری کی نویں وجہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں' نوابوں اور جاگیرداروں کو قرآن میں اپنی موت نظر آئی۔ چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوْا

دِہ خدایا نکتہ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطن ''الارضُ لِلّٰہ'' ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است و مفت

تو ان لوگوں نے کوشش کی کہ قرآن کی تعلیم عام نہ ہونے پائے اور یہ لوگ اپنے اثر ورسوخ اور

وما افسد الدین الا الملوک
و احبار سوء ورھبانھا

اور یہ بھی غالباً اسی ملی بھگت کا نتیجہ تھا کہ پورے ایک ہزار برس تک قرآن حکیم کا مسلمان اقوام کی مادری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی مخالفت کی گئی۔ واللہ اعلم!

جب ۱۲۰۶ء میں مسلمانوں کی حکومت ہند میں قائم ہوئی تو مسلمان جو اسلام اپنے ساتھ لائے اس کا منبع و مبنیٰ قرآن نہیں تھا بلکہ صرف علم فقہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ سلاطینِ دہلی یا علماءِ ہند نے قرآن کا ہندوستان کی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ کام اللہ کے ایک برگزیدہ بندے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے ۱۷۴۰ء کے قریب انجام دیا۔ یعنی مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے پانچ سو سال کے بعد شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ شائع ہوا' کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان قرآن سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔

یہ کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ انگریزوں کی حکومت باضابطہ طور پر ۱۷۷۲ء میں قائم ہوئی اور حکومت نے اپنی نگرانی میں ۱۷۹۲ء میں پوری بائبل کا ترجمہ بنگلہ زبان میں شائع کر دیا اور اس کے بعد ۱۸۰۶ء میں بائبل کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع ہو گیا اور یہ تراجم حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں مرزا پور سے بائبل کا ترجمہ اردو میں شائع ہوا اور اس کے بعد ہندی میں۔

ہندوستان میں اٹھارہ زبانیں ہیں اور دو سو بولیاں۔ آج بائبل کا ترجمہ ان ساری زبانوں میں موجود ہے' اور سامعین کی معلومات کے لیے یہ بھی بیان کیے دیتا ہوں کہ بائبل کا ترجمہ دنیا کی سات سو پینسٹھ (۷۶۵) زبانوں میں ہو چکا ہے اور طالبین کو برائے نام قیمت پر مل سکتا ہے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ ہم نے چھ سو برس حکومت کی' اور ہندوستان کی چھ زبانوں میں بھی قرآن کا ترجمہ نہیں کیا۔ ہندوستان میں ہندی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۹۲۶ء میں خواجہ حسن نظامی نے شائع کیا تھا۔

علماء کی تنگ نظری ملاحظہ ہو! فارسی میں ترجمہ کرنے کے ''جرمِ عظیم'' میں مولویوں نے بعض لوگوں کو شاہ صاحب (ولی اللہؒ) کے قتل پر آمادہ کیا۔ لیکن دشمنانِ دین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۸۰۵ء میں یعنی قیامِ حکومت کے چھ سو سال بعد شاہ ولی اللہؒ کے فرزند شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ، جو ۱۸۰۳ء سے ٹمٹما رہا تھا، گُل ہو گیا۔ ''مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب''۔ انگریزی حکومت کے زیر اثر مسلمان عوام قرآن تو کجا اسلام ہی سے بیگانہ ہو گئے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بیسویں صدی میں سب سے پہلے اکبر نے مسلمانوں کو قرآن کی طرف بلایا: ؎

مغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بڑھ کر!

ان کے بعد اقبال نے مسلمانوں سے کہا: ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن مسلمان من حیث القوم ہنوز قرآن سے بیگانہ ہیں۔ ان کی زندگی میں سب کچھ داخل ہے مگر قرآن داخل نہیں ہے، جبھی تو اقبال نے کہا: ؎

بہ بند صوفی و ملا اسیری
حیات از حکمت قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری

حرفِ آخر

فی الجملہ یہ بات میرے لیے باعث صد مسرت ہے کہ میرے عزیز بھائی ڈاکٹر اسرار احمد سلمہٗ نے مسلمانوں کو قرآن حکیم سے روشناس کرنے کے لیے ایک منظّم تحریک کا آغاز کر دیا ہے تاکہ مسلمانانِ پاکستان اپنے اندر وہ باطنی انقلاب پیدا کر سکیں جس کے نتیجے میں وہ خارج میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر ملت کی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف بلایا جائے اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ ؎

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟
زیرِ گردوں سرِ تمکین تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

واضح ہو کہ تعمیرِ فکر کے لیے سب سے پہلے تطہیرِ فکر لازمی ہے اور تطہیرِ فکر قرآن حکیم میں تدبر کے بغیر محالِ عادی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ برادر عزیز القدر کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آخر میں سامعین کے لیے اقبال کا ایک شعر بطور ارمغاں پیش کرتا ہوں ؎

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ اَم آبِ حیات

۞۞۞

[پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے یہ مقالہ تیسری سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ ۲۱ر تا ۲۳ر مارچ ۱۹۷۶ء بمقام ٹاؤن ہال لاہور میں پڑھا۔ اور یہ میثاق شمارہ جولائی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔]

جہاد کی اعلیٰ قسم

مولانا عبدالغفار حسنؒ

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ:

((اِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))[1]

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ظالم اقتدار کے سامنے انصاف کی بات کہنا جہاد کی عظیم تر انواع میں ہے۔''

الفاظِ حدیث اور راویانِ حدیث

حدیث کے یہ الفاظ جامع ترمذی میں بیان ہوئے ہیں۔ یہی حدیث معمولی سی الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ حضرت ابوامامہؓ سے بھی مروی ہے۔ یہ حدیث ابوداوٗد' مسند احمد' ابن ماجہ' طبرانی کبیر اور بیہقی میں مذکور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''مِنْ اَعْظَمِ الجِهَادِ'' کی جگہ ''اَفْضَلِ الجِهَادِ'' اور ''كَلِمَةُ عَدْلٍ'' کی جگہ ''كَلِمَةُ حَقٍّ'' بیان ہوا ہے۔

یہی حدیث طارق بن شہابؓ (صحابی) سے بھی مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے دریافت کیا' جبکہ وہ اپنا پاؤں رکاب میں ڈالے ہوئے تھا' کونسا جہاد افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))[2] حدیث کے یہی الفاظ زیادہ مشہور اور زبان زد ہیں اور سند کے لحاظ سے بھی یہی زیادہ معتبر ہیں۔

اسنادی حیثیت

امام ترمذی نے اس حدیث کو ''حسن غریب'' قرار دیا ہے (یعنی اس خاص سند کی بنا پر جو کتاب میں مذکور ہے) نسائی اور ابن ماجہ کی روایت کو مشہور محدث امام منذری نے صحیح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ترمذی کی روایت میں ایک راوی عطیہ العوفی ناقابل اعتماد ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ شارح ترمذی لکھتے ہیں کہ ابوامامہؓ اور طارق بن شہابؓ

کی روایات سے ترمذی کی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ (یعنی مجموعی طور پر یہ سب روایات ہم معنی اور قابل اعتماد ہیں)۔[۳]

الفاظِ حدیث کی تشریح

(۱) ''اَلجِهَادُ'' جہاد کی تشریح امام راغب نے اس طرح کی ہے: اِسْتِفْرَاغُ الْوُسْعِ فِیْ مُدَافَعَةِ الْعَدُوِّ ''دشمن کے روکنے میں اپنی توانائی صرف کرنا۔'' اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ جہاد یا مجاہدہ تین قسم کا ہوتا ہے:

(ا) ظاہری دشمن سے مقابلہ

(ب) شیطان سے کشمکش

(ج) اپنے نفس سے زور آزمائی

لیکن لسان العرب میں ''جہاد'' کی تعریف زیادہ وسیع اور صحیح انداز میں بیان ہوئی ہے:

اَلْجِهَادُ مُحَارَبَةُ الْاَعْدَاءِ وَهُوَ الْمُبَالَغَةُ وَاِسْتِفْرَاغُ مَا فِی الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ مِنْ قَوْلٍ وَفِعْلٍ

(۲) ''کَلِمَةٌ'' کلمہ سے یہاں ہر وہ قول یا تحریر مراد ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل ہو۔

(۳) ''حَقٍّ'' قرآن حکیم میں یہ کلمہ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس حدیث میں ''حق'' سے مراد ہر وہ عقیدہ یا عمل ہے جو شرعاً ثابت ہے' اکثر اس کے بالمقابل ''باطل'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(۴) ''سُلْطَانٍ'' اس لفظ کے اصلی معنی غلبہ واقتدار کے ہیں۔ لیکن کبھی یہ صاحبِ اقتدار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ملک کے حاکم سے لے کر گھر کے قوام' مختلف انجمنوں اور تنظیموں کے سربراہ اپنے اپنے غلبہ وتسلط کے لحاظ سے اس لفظ کے مصداق ہو سکتے ہیں لیکن اس لفظ کا زیادہ تر اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھوں میں سیاسی قوت ہوتی ہے' کبھی عوام بھی اثر وغلبہ کی بنا پر سلطانی شکوہ ودبدبہ حاصل کر لیتے ہیں' ان کی کج روی پر ٹوکنا بھی اس حدیث کی بنا پر افضل جہاد شمار ہوگا۔

(۵) ''جَائِرٍ'' عربی میں ''جور'' کے معنی کج روی کے ہیں۔ اب یہی کج روی احکام اور قوانین کے اجراء میں کی جائے تو ظلم کے ہم معنی قرار پاتی ہے اسی لیے جائر کا لفظ ظالم کے

مترادف سمجھا جاتا ہے۔

ترمذی کی روایت میں ''حق'' کی جگہ ''**عدل**'' کا لفظ آیا ہے۔ **عدل** کا لفظ عربی میں جَور کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔

مطلبِ حدیث

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص یا گروہ جس کو جہاں بھی اثر و رسوخ اور غلبہ واقتدار حاصل ہے' وہاں کلمۂ حق کا اظہار افضل جہاد ہے۔ مشہور محدث خطابیؒ نے اس کے افضل جہاد ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ مسلمان جب دشمن سے مقابلہ کرتا ہے تو وہاں امید وبیم دونوں قسم کی کیفیت پائی جاتی ہے' اگر فتح ہوئی تو غنیمت حاصل ہوگی اور اگر قتل ہوا تو شہادت کا درجہ ملے گا۔ لیکن اس حدیث میں جس جہاد کا ذکر ہے اس میں جان و مال کی بربادی یا نقصان کا پہلو زیادہ غالب ہے' یہاں غنیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ جان کی سلامتی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ کسی ملک کا حاکم جب ظلم و جور کرنے پر تُل جاتا ہے تو ملک کی پوری آبادی اس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ظاہر ہے کہ جنگ میں چند کافروں کو قتل کر دینے سے پورے ملک کی جمِ غفیر آبادی کو ظلم وستم سے بچانا بڑا جہاد ہوگا۔ ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ کلمۂ حق کا اظہار واعلان کا فریضہ زیادہ تر مسلمانُ حکام کے مقابلے میں پیش آتا ہے اور جہاد بصورت قتال کا معاملہ صریح کافروں سے ہوتا ہے''۔

یہ بات واضح ہے کہ غیروں سے لڑنے میں شہرت اور نام ونمود کا موقع بھی مل سکتا ہے' لیکن اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے کلمۂ حق کے اظہار کا صلہ سازش' غداری اور بغاوت کے الزام کے سوا اور کیا مل سکتا ہے۔ ہاں اگر عوام ہم خیال ہوں تو اس قسم کی تنقید کی حوصلہ افزائی ''زندہ باد'' کے نعروں سے ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر عوام اور حکام دونوں پر یا عوام پر اس انکار اور منکر کی زد پڑتی ہو تو پھر ہر طرف سے مخالفت اور ایذا رسانی بلکہ ہلاکت و بربادی کا پہلو غالب رہتا ہے۔

اس حدیث سے تنقید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے چند اصول و آداب معلوم ہوتے ہیں:۔

(۱) تنقید میں تملق' چاپلوسی اور خوشامدانہ انداز کے بجائے جرأت مندانہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے۔ لفظِ جہاد جرأت وشجاعت کو ظاہر کرتا ہے۔

(۲) اس روک ٹوک میں صرف اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ ذاتی انتقام یا نام ونمود کی خواہش اس ساری کوشش کو بے اثر بنا دے گی۔ قرآن وسنت میں جہاد کا لفظ جب بغیر کسی قید کے بولا جاتا ہے تو اس سے بھی جہاد فی سبیل اللہ ہی مراد ہوتا ہے' یعنی ایسی کوشش جس کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۳) اُسی معروف کی تبلیغ ہونی چاہیے جس کا معروف ہونا شرعاً ثابت ہے۔ اسی طرح صرف ایسے منکر پر تنقید ضروری ہے جس کا منکر ہونا قرآن وسنت سے واضح ہے۔ حدیث میں لفظ ''حق'' سے بظاہر یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ خاص ذوق یا خاص ماحول کی بنا پر معروف ومنکر کی تعیین درست نہیں۔

(۴) ''جائر'' کا لفظ بتلاتا ہے کہ حاکم یا سربراہ جس معاملہ میں کج روی اختیار کرتا ہے' صرف اسی پر تنقید وانکار ہونا چاہیے۔ ہاں اگر اس کی پوری زندگی سراپا ظلم وجور بنی ہوئی ہے تو پھر اس کے تمام معاملات تنقید کا ہدف بنیں گے۔ پہلی صورت میں معروف میں تعاون اور منکر میں عدم تعاون ضروری ہے' جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدۃ:۲)

(۵) اس حدیث سے مسلم معاشرہ کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کچھ زبانیں ایسی ہونی چاہئیں جو خلافِ حق باتوں پر بغیر کسی مداہنت کے اپنا فرض ادا کرنے پر ہر وقت آمادہ رہیں اور مسلم حکام اور سربراہوں کا فرض ہے کہ وہ اس تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اصلاحِ حال کی کوشش کریں۔

خلافتِ راشدہ میں اس قسم کی آزاد' پاکیزہ فضا قائم تھی۔ خلفاء مخلصانہ تنقید کی حوصلہ افزائی بلکہ اس کی تلقین کرتے تھے اور رعیت میں سے جس کو بھی محسوس ہوتا کہ خلیفہ غلطی پر ہے تو فوراً اس پر ٹوک دیتا۔ حضرت ابوبکر ؓ کا مشہور خطبہ ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: اِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ ''اگر میں کج روی کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔'' خود رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ سے بھی تنقید کی حوصلہ افزائی کا سبق ملتا ہے۔ صحابہ کرام ؓ نے جب کبھی یہ محسوس کیا کہ آپ ؐ کا عمل آپ ؐ کے ارشاد سے مطابقت نہیں رکھتا تو فوراً اس خلش کا اظہار کر دیا اور آپ ؐ نے بغیر کسی ملال وناگواری کے بروقت ان کی غلط فہمی رفع فرما دی۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے

صاحبزادے ابراہیمؓ کا آخری وقت آن پہنچا اور سانس اُکھڑنے لگا تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس موقع پر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: وَاَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ ''یارسول اللہ! لوگ روتے ہیں اور آپ بھی روتے ہیں؟'' یعنی آپؐ تو ہمیں بے صبری سے منع فرماتے ہیں اور خود آپؐ کی آنکھیں اشک بار ہیں۔ جواب میں آنحضرت ﷺ نے اس غلط فہمی کو ان الفاظ میں رفع فرمایا:

((اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا))(٤)

''بلاشبہ آنکھ اشک بار ہے، دل رنجیدہ ہے لیکن زبان سے وہی نکلتا ہے جس سے ہمارا رب راضی ہے۔''

(۲) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے (یعنی اپنے نواسے) کے پاس پہنچے اور اس وقت ان پر نزع کی حالت طاری تھی۔ یہ منظر دیکھ کر آنحضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! ''مَاھٰذَا؟ اے اللہ کے رسول یہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ جَعَلَھَا اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِہٖ))(٥) ''یہ آنسو اس رحمت و شفقت کی بنا پر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہوئی ہے''۔(٥)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صومِ وصال (یعنی بغیر افطار کیے پے در پے روزے رکھنے) سے منع فرمایا۔ ایک آدمی نے سوال کیا ''آپ خود تو صومِ وصال رکھتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کون میرے جیسا ہے؟'' میں رات گزارتا ہوں اس حال میں کہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے''۔(٦)

آنحضور ﷺ کا یہی طرزِ عمل تھا جس کا عکس خلفاء راشدین کے دور میں ملتا ہے۔ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کی درخشاں مثالیں ملتی ہیں۔ اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں بھی انتہائی وسعتِ قلبی سے کام لیتے ہوئے تیز و تند تنقید کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وسعتِ قلبی

(۱) دورِ فاروقی کا واقعہ ہے، مسلمانوں کو غنیمت میں چادریں حاصل ہوئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ چادریں انصاف کے ساتھ مسلمانوں میں تقسیم کر دیں، اُن کو اور ان کے

صاحبزادے حضرت عبداللہ ؓ کو ایک ایک چادر ملی‘ جیسا کہ عام مسلمانوں کے حصے میں آئی تھیں۔ حضرت عمر ؓ بلند قامت تھے‘ ان کو ایک چادر کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے اپنی چادر بھی ان کے حوالے کر دی تا کہ ان کا ایسا لباس تیار ہو سکے جو ان کے لیے کافی ہو۔ حضرت عمرؓ اس لباس کو پہننے کے بعد خطبہ دینے کے لیے تشریف لائے‘ حمد و ثنا اور رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کے بعد انہوں نے فرمایا: ’’اے لوگو! سنو اور اطاعت کرو‘‘۔ اس موقع پر جلیل القدر صحابی سلمان فارسی ؓ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا ’’ہم نہ سنیں گے نہ مانیں گے‘‘۔ حضرت عمر ؓ نے پوچھا ’’کیوں؟‘‘ حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ’’اتنا کپڑا آپ کو کہاں سے مل گیا؟ آپ کو تو ایک ہی چادر ملی تھی اور وہ ایک چادر آپ جیسے بلند قد و قامت والے انسان کو کیسے کافی ہو سکتی ہے؟‘‘ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ’’صبر سے کام لو! اور آواز دی یا عبداللہ!‘‘ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر دوبارہ آپ نے فرمایا: ’’یا عبداللہ بن عمر!‘‘ تو وہ فوراً بول اٹھے ’’لبیک یا امیر المؤمنین!‘‘ مسلمانوں کے امیر میں حاضر ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ’’میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ جس چادر کا میں نے تہمد بنایا ہے‘ کیا وہ تمہاری نہیں ہے؟‘‘ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا جی ہاں‘ میری ہے۔ تو حضرت سلمانؓ نے کہا ’’اب حکم دیجیے‘ ہم سنیں گے اور مانیں گے‘‘۔ (۷)

ممکن ہے یہاں یہ کہا جائے کہ حضرت عمر ؓ کا تو بہت اونچا مقام تھا اور اسی طرح حضرت سلمان ؓ بھی بڑی شان کے صحابی تھے‘ ان دونوں حضرات سے اسی اعلیٰ کردار کی توقع تھی۔ اس لیے کوئی اور مثال سامنے آنی چاہیے۔

حضرت معاویہ ؓ اور تنقید کی حوصلہ افزائی

(۲) ایک دن حضرت معاویہ ؓ منبر پر کھڑے ہوئے۔ (اس سے قبل انہوں نے چند مسلمانوں کے مقرر وظائف دینے بند کر دیے تھے۔) انہوں نے خطبے کے آغاز میں فرمایا: ’’سنو اور مانو‘‘۔ فوراً اُسی وقت حضرت ابو مسلم ارغوانی محاسبے کے لیے کھڑے ہو گئے اور مذکورہ بالا وظائف کی بندش پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ’’نہ ہم سنیں گے اور نہ مانیں گے‘‘۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا: ’’ابو مسلم! یہ کیوں؟‘‘ ابو مسلم نے جواب دیا ’’اے معاویہ! تمہیں وظائف روکنے کا کیا حق تھا؟ یہ مال نہ تمہاری محنت سے حاصل ہوا ہے‘ نہ تمہارے باپ کی مشقت کا اس میں دخل ہے اور نہ اسے تمہاری ماں نے جمع کیا ہے؟‘‘ یہ بات سن کر حضرت

معاویہؓ غضب ناک ہو گئے' لیکن کچھ بولے بغیر منبر سے اتر آئے اور صرف اتنا کہا اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو۔ کچھ دیر کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد غسل کر کے تشریف لائے اور فرمایا: ابومسلم نے ایسی بات کی جس نے میرا غصہ بھڑکا دیا تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے' شیطان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو صرف پانی سے بجھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے جب کوئی غیظ وغضب میں مبتلا ہو تو اسے غسل کر لینا چاہیے' اسی لیے میں غسل کر کے آ رہا ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ابومسلم نے جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ درست ہے' یہ مال نہ میری محنت سے حاصل ہوا ہے اور نہ میرے باپ کی کوشش سے' آ کر اپنے وظائف لے جاؤ۔(۸)

ممکن ہے یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ حضرت معاویہؓ حلم و بردباری میں بلند مقام رکھتے ہیں اور ابومسلم کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔ پھر یہ وہ دور تھا جب کہ حاکم اور رعایا دونوں پر نیکی غالب تھی۔ اب مناسب یہ ہے کہ اس دور کے بعد کی مثالیں پیش کی جائیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ تاریخ کے ہر دور میں ایسے اللہ کے بندے رہے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے اصحابِ سطوت حکام اور خلفاء کے سامنے حق بات کہنے سے گریز نہیں کیا۔

ذیل میں مختلف ادوار کے واقعات پیش کیے جاتے ہیں جو حقیقت میں زیر مطالعہ حدیث کی عملی تفسیر ہیں۔ اس واقعاتی تشریح کا اکثر حصہ شام کے ممتاز عالم عبدالعزیز البدری کی ایک اہم تصنیف ''**الاسلام بین العلماء والحکام**'' سے ماخوذ ہے۔ ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اللہ کے نیک بندوں نے کس طرح اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر اس حدیث پر عمل کیا ہے۔ اس واقعاتی تشریح کے بعد دعوت و اصلاح کے ان اصول و آداب کا ذکر کیا جائے گا جو قرآن وسنت اور سلف صالحین کے اعلیٰ کردار سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) امام سفیان ثوریؒ کا بیان ہے جب ابوجعفر منصور حج کے لیے مکہ مکرمہ پہنچے تو انہوں نے کہا کہ سفیان ثوریؒ سے میری ملاقات انتہائی ضروری ہے۔ لوگ میری گھات میں رہے اور بیت اللہ کے قریب انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور منصور کے پاس لے گئے۔ جب میں منصور کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور کہا کہ آپ ہمارے پاس کیوں نہیں آتے تاکہ ہم اپنے معاملات کے بارے میں آپ سے مشورہ کر سکیں اور اس کے مطابق اپنا رویہ اختیار کر سکیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے اس سفر میں کیا کچھ خرچ کیا؟ منصور نے جواب دیا

مجھے کیا معلوم‘ میں نے وکیل اور نائب مقرر کیے ہوئے ہیں‘ وہ سب حساب جانتے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ کل جب تم خدا کے سامنے کھڑے ہو گے تو وہ اس بارے میں باز پرس کرے گا‘ تم کیا جواب دو گے؟ حضرت عمرؓ کا تو یہ حال سنا ہے کہ جب انہوں نے حج کیا تو اپنے غلام سے پوچھا کہ اس سفر میں کیا خرچ ہوا ہے؟ غلام نے کہا ’’اٹھارہ دینار‘‘۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ’’افسوس! ہم نے مسلمانوں کے بیت المال پر زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے‘‘۔ اس کے بعد ابوسفیانؒ نے کہا کہ حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ’’جو شخص اللہ کے مال میں اور اس کے رسول کے مال میں گُل چھرے اڑاتا ہے اس کے لیے کل جہنم کی آگ ہے‘‘۔ اس موقع پر منصور کے سیکرٹری ابوعبیداللہ نے کہا: کیا امیر المؤمنین کے سامنے اس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں پوری مؤمنانہ قوت کے ساتھ حضرت سفیانؒ نے کہا ’’تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں‘ خاموش رہو۔ فرعون نے ہامان کو ہلاک کیا تھا اور ہامان فرعون کی بربادی کا سبب بنا تھا‘‘۔ (۹)

(۴) اُندلس کے مشہور اُموی خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے ’’زہراء‘‘ نامی ایک شہر تعمیر کیا اور اس میں شاندار محلات بنوائے۔ وہ دن رات اس کی زینت و آرائش کی دھن میں رہتا تھا۔ خود بہ نفسِ نفیس اس میں حصہ لیتا تھا۔ اس کا انہماک یہاں تک بڑھا کہ ایک دن نمازِ جمعہ سے بھی رہ گیا۔ اس زمانے میں منذر بن سعیدؒ جامع مسجد کے خطیب اور شرعی عدالت کے قاضی تھے‘ انہوں نے سوچا کہ خلیفہ ’’الزہراء‘‘ کی تعمیر و آرائش میں حد سے بڑھتا چلا جا رہا ہے‘ فضول خرچی کی انتہا ہو گئی ہے‘ اگر اس کو برسرِ منبر نہ ٹوکا گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فرض کی ادائیگی میں بہت بڑی کوتاہی ہو گی۔ جمعہ کا دن آیا‘ آپ منبر پر تشریف لائے‘ خلیفہ ناصر بھی موجود تھا‘ پوری مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی‘ آپ نے اپنے خطبے کا آغاز اس آیت کو پڑھتے ہوئے کیا:

﴿اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیۡۤ اَمَدَّکُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّکُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳۵﴾﴾ (الشعراء)

’’کیا تم ہر بلند مقام (یادگار کے طور پر) عبث (بلاضرورت) بناتے ہو؟ اور بناتے ہو بڑے محل کہ شاید تم ہمیشہ رہو گے؟ اور جب تم کسی پر دارو گیر کرنے لگتے ہو تو بالکل جابر

بن کر دار و گیر کرتے ہو۔سوتم (کو چاہیے کہ) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔اس سے ڈرو جس نے تمہاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو (یعنی) مویشی' بیٹوں' باغوں اور چشموں سے تمہاری امداد کی۔مجھ کو تمہارے حق میں (اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے) ایک بڑے سخت دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔''

اس کے بعد آپ نے سورۃ النساء کی یہ آیت تلاوت کی:

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ﴾ (النساء:۷۷)

''کہہ دیجیے کہ دنیا کا متاع (سامان) تھوڑا ہے اور آخرت اُس کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔''

ان آیات کی تشریح کے بعد پورے زوردار انداز میں آپ نے اس فضول خرچی پر سرزنش کی اور پھر یہ آیت پڑھی:

﴿اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۱۰۹﴾ (التوبة)

''پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت (مسجد) کی بنیاد اللہ سے ڈرنے پر اور اُس کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی (یعنی غار) کے کنارے پر جو گرنے ہی کو ہو' رکھی ہو' پھر وہ (عمارت) اُس (بانی) کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے۔اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (دین کی) سمجھ ہی نہیں دیتا۔''

یہ پورا خطبہ اسی موضوع پر جاری رہا' سننے والے انتہائی متاثر ہوئے' خود خلیفہ ناصر سمجھ گیا کہ اس خطبے کا مخاطب خود اُس کی ذات ہے۔اُس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور وہ اپنی کوتاہی پر بہت ہی نادم ہوا۔خلیفہ ناصر اس بات کو برداشت نہ کر سکا کہ علانیہ طور پر پوری شدت کے ساتھ اس کا محاسبہ ہو اور برسرِ منبر اس کی غلطیوں پر ٹوکا جائے۔اس موقع پر اس نے اپنے بیٹے حَکم سے شکوے کے طور پر کہا ''خدا کی قسم! منذر کے خطبے کا رخ میری ہی طرف تھا اور اس نے مجھ پر بڑی زیادتی کی اور تنقید و احتساب میں حد سے بڑھ گیا۔'' انتہائی غصے میں خطبے کے کلمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے کہا ''بخدا میں اس کے پیچھے جمعہ کی نماز نہیں ادا کروں گا'' اس کے بعد خلیفہ نے دوسری مسجد جامع قرطبہ میں جمعہ کی نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ یہ تھی خلیفہ ناصر کی جانب سے منذر بن سعید کی سزا کہ اس کے پیچھے صرف نماز پڑھنا ترک کر دیا۔

خلیفہ ناصر کے بیٹے نے یہ دیکھا کہ اس کے والد کو الزہراء کے ساتھ بہت گہرا قلبی لگاؤ ہے اور ساتھ ہی وہ الزہراء کی وسیع ترین مسجد میں نماز پڑھنے کو اہمیت دیتا ہے' تو اس نے کہا: ابا جان! آخر وہ کون سی رکاوٹ ہے جس کی بنا پر آپ منذر بن سعید کو ان کے منصب سے ہٹا نہیں دیتے؟ آپ ان کو ناپسند بھی کرتے ہیں' ان کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے' لیکن پھر بھی ان کو امامت کے منصب پر برقرار رکھا ہوا ہے' آخر یہ کیوں؟'' خلیفہ ناصر نے ڈانٹتے ہوئے کہا: کیا منذر بن سعید جیسا آدمی جو اپنے علم وفضل میں یکتا ہے' معزول کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ صرف اس لیے کہ اس نفس کو خوش کر لیا جائے جو صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے' یہ ممکن نہیں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں اپنے اور اس کے درمیان منذر بن سعید جیسے زاہد و متقی آدمی کو شفیع اور سفارشی نہ بناؤں۔ منذر بن سعید نے تو اس طرح میرے غصے کو بھڑکا دیا کہ میں قسم کھا بیٹھا۔ اب میری دلی تمنا ہے کہ مجھے کوئی ایسی راہ مل جائے کہ میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کر سکوں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: منذر بن سعید اپنی آخری سانس اور میری آخری سانس تک جمعہ پڑھاتے رہیں گے' حقیقت یہ ہے کہ ان کا بدل ملنا ناممکن ہے۔[۱۰]

(۵) خلیفہ عباسی المقتفی لامر اللہ نے یحییٰ بن سعید جیسے ظالم کو قاضی بنا دیا۔ اس پر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی حمیت بھڑک اٹھی اور انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم نے انتہائی ظالم و جابر کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا ہے۔ کل خدا کے ہاں کیا جواب دو گے؟ خلیفہ اس پر کانپ اٹھا' اس نے فوراً اس ظالم حاکم کو معزول کر دیا۔[۱۱]

(۶) العز بن عبدالسلام جن کا لقب سلطان العلماء ہے' جب ان کو الملک الصالح اسماعیل کی جانب سے ۶۳۷ھ میں جامع مسجد دمشق کی خطابت کا منصب سونپا گیا تو اپنی حق گوئی کی بنا پر زیادہ دیر تک اس منصب پر برقرار نہ رہ سکے۔ ۶۳۸ھ میں ان کو معزول ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ملک اسماعیل نے مسلمانوں سے خیانت اور غداری کی۔ العز بن عبدالسلام اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ جامع مسجد کا منبر جو کہ حقیقت میں منبر نبوی ہے' مداہنت اور حق کے بارے میں خاموشی سے آلودہ ہو۔ حق گوئی کا بدلہ یہ ملا کہ اس منصب سے معزول کیے گئے اور قید خانے میں ڈال دیے گئے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قابل اعتبار مؤرخین نے لکھا ہے کہ ملک اسماعیل کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اس پر حاکم مصر نجم الدین بن ایوب حملہ نہ کر دے۔ اس لیے اس نے صلیبی فرنگیوں سے

معاہدہ کرلیا کہ نجم الدین کے مقابلے میں اس کی مدد کریں گے اوراس مدد کے عوض چند قلعے اور شہران کے حوالے کر دیے۔ جنگی لحاظ سے ان قلعوں کی بڑی اہمیت تھی۔ پھر مزید یہ کہ ملک اسماعیل نے فرنگیوں کو اجازت دے دی کہ وہ دمشق میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتے ہیں اور اسلحہ خرید سکتے ہیں۔ العز بن عبدالسلام نے اس واقعہ پر محض فتویٰ ہی نہیں دیا بلکہ برسرِ منبر اس طرزِ عمل کی مذمت کی اوراس خیانت کے نتائج کو بے نقاب کیا۔

اس زمانے میں خطبہ ٔجمعہ میں حکام کے لیے دعا ہوتی تھی اوراس کواطاعت ووفاداری کی علامت سمجھا جاتا تھا' لیکن العز بن عبدالسلام نے اس واقعہ کے بعد سے اس کے لیے دُعا کے الفاظ استعمال کرنے ترک کر دیے' اس کے بجائے وہ یہ دعا کرتے تھے:

اللھم ابرم لھذہ الامۃ ابرام رشد تعز فیہ اولیاء ک' وتذل فیہ اعدائک ' ویعمل فیہ بطاعتک وینھی فیہ عن معصیتک

''اے اللہ! اس اُمت کو شریعت کے مطابق ایسا استحکام اور مضبوطی عطا فرما جس کی بنا پر تیرے دوست عزت و رفعت پائیں اور تیرے دشمن ذلیل وخوار ہوں' تیری شریعت کے مطابق عمل ہو' اور تیری نافرمانی سے روکا جائے''۔

اس موقع پر ملک اسماعیل دمشق میں موجود نہیں تھا۔ جب اسے اس خطبہ ٔجمعہ کی اطلاع ملی تو اس نے العز بن عبدالسلام کو خطابتِ جمعہ سے معزول کرنے اور جیل میں ڈالنے کا حکم دے دیا اور جب وہ دمشق پہنچا تو اس نے آپ کو جیل سے تو رہا کر دیا لیکن گھر میں نظر بندی کے احکام جاری کر دیے اور فتویٰ دینے سے روک دیا۔ (طبقات السبکی)

(۷) غازان تاتاری' مسلمان تاتاران میں چوتھا بادشاہ تھا۔ اس کے مقابلے میں امام احمد بن تیمیہؒ نے انتہائی جرأت مندانہ اقدام کا ثبوت دیا اور حق گوئی کی اعلیٰ مثال قائم کر دی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ۶۹۸ھ کے اواخر میں اطلاع ملی کہ غازان تاتاری حلب پر چڑھائی کر رہا ہے۔ وادیٔ سلمیہ میں ۲۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو غازان کے لشکر کی ناصر بن قلاوون کی فوج سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ انتہائی شدید معرکے کے بعد ناصر کو شکست ہوئی' فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ ناصر اوراس کے اعیان وانصار سب کے سب دمشق سے مصر کی جانب پناہ کے لیے دوڑ پڑے۔ صورت حال یہ ہوگئی کہ دمشق میں نہ کوئی حاکم باقی رہا نہ کوئی ذمہ دار افسر۔ اس موقع پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے عوام کا ساتھ دیا اور وہ دمشق میں ٹھہرے رہے۔ تھوڑے بہت ذمہ دار افراد شہر میں باقی رہ گئے تھے' ان کو لے کر غازان سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ وفد کے رئیس خود

شیخ الاسلام تھے۔ النبک نامی بستی میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں کے درمیان انتہائی تلخ گفتگو ہوئی۔ شیخ الاسلامؒ نے غازان پر کڑی تنقید کی کہ اس نے عہد کو توڑا اور مسلمانوں کی آبادی میں بے جا دخل اندازی کی ہے۔ اس گفتگو کی پوری تفصیل ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں دی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ابن تیمیہؒ نے غازان سے (بذریعہ ترجمان) کہا ہمیں معلوم ہوا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو‘ تمہارے ساتھ قاضی‘ امام‘ علماء اور مؤذن بھی موجود ہیں‘ لیکن افسوس ہے کہ تم نے ہمارے ملک پر چڑھائی کر ڈالی اور ہمارے علاقے میں گھس آئے۔ آخر یہ کیوں؟ تمہارے باپ دادا کافر تھے‘ لیکن انہوں نے معاہدہ کے بعد اسلامی علاقوں پر چڑھائی نہیں کی‘ لیکن تو نے معاہدہ کیا اور اسے توڑ ڈالا‘ قول وقرار کیا لیکن اس کی پاسداری نہ کی۔ اس گفتگو میں اس تنقید کا انداز انتہائی جرأت مندانہ تھا اور صرف اللہ کے لیے انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا‘ ان کے دل میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔

اس کے بعد غازان نے وفد کو کھانے پر دعوت دی۔ وفد کے تمام اراکین کھانے پر بیٹھ گئے‘ لیکن امام ابن تیمیہؒ نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ جب اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے کہا میں یہ کھانا کیسے کھا سکتا ہوں‘ یہ سب کچھ لوٹ مار سے حاصل کیا گیا ہے اور لوگوں کے درخت کاٹ کر اسے پکایا گیا ہے۔ غازان بڑی توجہ سے امام ابن تیمیہؒ کی باتیں سنتا رہا اور امام صاحب کی ہیبت سے اس کا دل معمور ہو گیا۔ اس نے پوچھا یہ شیخ کون ہیں؟ میں نے ان جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا‘ بڑے ہی جرأت مند ہیں۔ میں نے آج تک کوئی شخص نہیں دیکھا جس کی بات نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہو اور نہ میں نے کوئی ایسا فرد دیکھا ہے جس کے سامنے میں بالکل بے بس ہو گیا ہوں جبکہ اس شخصیت کے سامنے میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہوں۔ لوگوں نے امام ابن تیمیہؒ کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی تفصیل بتائی‘ اس پر غازان نے ان سے دعا کی درخواست کی۔ امام ابن تیمیہؒ نے ان الفاظ میں دعا کی:

اللھم ان کان عبدک ھذا انما یقاتل لتکون کلمتک العلیا ولیکون الدین کله لک فانصره وایّده وملکه العباد والبلاد وان کان قام ریاء وسمعة وطلبا للدنیا ولتکون کلمته ھی العلیا ویذل الاسلام واھله فخذه وزلزله ودمّره واقطع دابره

’’اے اللہ! اگر یہ تیرا بندہ اس لیے جنگ کرتا ہے کہ تیرا حکم بلند ہو اور یہ کہ تیری فرماں

روائی کا غلبہ ہو تو اس کی مدد فرما' اس کی تائید کر' اپنے بندوں اور اپنی زمین پر اس کو غلبہ دے۔ اور اگر یہ ریاء و نمائش کے طور پر کھڑا ہوا ہے' اور دُنیا طلبی اس کا مقصد ہے' اور یہ اپنا کلمہ بلند کرنا چاہتا ہے' اور اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرنا اس کا مطلوب ہے' تو اے اللہ! اس کو پکڑ لے' ہلا ڈال' اور اس کو تباہ کر' اور اس کی نسل کاٹ دے''۔

غازان ہاتھ اٹھائے دُعا پر آمین آمین کہہ رہا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے خوف سے اپنے کپڑے سمیٹنے شروع کر دیے کہ کہیں ابن تیمیہؒ کو قتل کرنے کا حکم نہ دے دیا جائے اور ہمارے کپڑے اُس کے خون سے آلودہ نہ ہو جائیں۔ جب ہم اس کے دربار سے نکلے تو قاضی القضاۃ نجم الدین اور دوسروں نے امام صاحبؒ سے کہا کہ آپ نے تو آج ایسی گفتگو کی کہ اپنی اور ہماری ہلاکت کا سامان فراہم کر لیا۔ خدا کی قسم' اب ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ امام ابن تیمیہؒ نے کہا: میں بھی تمہاری رفاقت نہیں چاہتا۔ راوی کا بیان ہے کہ قاضی القضاۃ اور دوسرے ساتھی ایک ٹولی کی صورت میں روانہ ہو گئے اور امام ابن تیمیہؒ چند ساتھیوں سمیت کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئے۔ غازان کے امراء اور وزراء کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو سب دعا کرانے کے لیے امام کے اردگرد جمع ہو گئے۔

امام ابن تیمیہؒ تین سو سواروں کے ساتھ دِمشق واپس ہوئے۔ راستے میں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا' لیکن جن لوگوں نے امام ابن تیمیہؒ کی رفاقت سے انکار کیا تھا ان پر راستے میں تاتاریوں کی ایک جماعت نے حملہ کر دیا' سامان چھین لیا اور کپڑے اتار لیے۔(۱۲)

مذکورہ بالا واقعات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علماءِ حق کی تنقید ان امور پر تھی جو شریعتِ اسلامیہ کے خلاف تھے' اس تنقید اور انکارِ منکر سے حکام کی ذات کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا مقصود نہ تھا۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ اُمت کا کوئی فرد بھی معصوم نہیں قرار دیا جا سکتا' خوش نصیب وہ ہے جو اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور نصیحت قبول کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے۔

یہاں سے وہ واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماءِ اسلام نے گزشتہ دور میں کس طرح جرأت اور ثابت قدمی کے ساتھ غلط کار حاکموں کے مقابلے میں اعلانِ حق کیا' خواہ اس اعلانِ حق کی پاداش میں ان کو اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کر دینی پڑی۔

(۸) حطیط زیاد نامی ایک عالم حجاج کے پاس لائے گئے۔ حجاج نے ان سے پوچھا:

''کیا تم حطیط ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ''ہاں' جو چاہے تم مجھ سے پوچھو' میں مقامِ ابراہیم کے پاس اپنے رب سے عہد کر چکا ہوں کہ ہر سوال کے جواب میں سچ بولوں گا' آزمائش کا دور آیا تو ثابت قدم رہوں گا' اور اگر راحت و عافیت میسر آئی تو اپنے رب کا شکر کروں گا''۔

حجاج نے کہا ''میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' جواب دیا: ''میرے نزدیک تو اللہ کے دشمنوں میں سے ایک ہے' تو دین کی حرمتوں کو پامال کر رہا ہے اور محض تہمت اور شک و شبہ کی بنا پر بے گناہوں کو قتل کر ڈالتا ہے''۔ حجاج نے کہا ''امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' جواب دیا: ''اس کا جرم تیرے جرم سے بھی بڑھا ہوا ہے' خود تیرا وجود اس کے جرائم کا ایک حصہ ہے''۔ یہ باتیں سن کر حجاج غصے میں آ گیا اور حطیط کو سزا دینے اور سخت عذاب کا مزا چکھانے کا حکم دے دیا۔ عذاب کی انتہائی شکل یہ اختیار کی گئی کہ بانس کی کھپچیاں چیری گئیں اور ان کو بدن کے گوشت والے حصے پر رکھ کر رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ پھر انہوں نے ان کھپچیوں کو اس طرح کھینچنا شروع کیا کہ گوشت ہڈیوں سے الگ ہو گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس اللہ کے بندے نے اُف تک نہ کی۔ اس موقع پر حجاج سے کہا گیا کہ اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔ حجاج نے کہا اسے یہاں سے نکال کر بازار میں سڑک پر پھینک دو۔ جعفر راوی کا بیان ہے کہ میں اور حطیط کا ایک دوست اس کے پاس پہنچے اور ہم نے اس سے کہا اگر کوئی ضرورت ہے تو بتاؤ۔ جواب دیا ''پانی کا ایک گھونٹ''۔ فوراً پانی لایا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس جواں سال' باہمت حق گو نے جامِ شہادت نوش کیا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ حطیط زیاد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ شہادت' شہادت فی سبیل اللہ تھی اور حجاج کا یہ ظلم ایسا نہیں ہے کہ جس کی خدا کے ہاں گرفت نہ ہو۔ قیامت کے دن جب تمام جھگڑے پیش ہوں گے اور تمام مظلوم فریادی بن کر وہاں جمع ہوں گے تو اُس دن حجاج اس خوفناک ظلم کی سزا پا کر رہے گا۔(۱۳)

(۹) بنواُمیہ کو دِمشق سے نکالنے کے بعد جب عبداللہ بن علی وہاں پہنچے تو اس نے امام اوزاعیؒ کو طلب کیا۔ امام اوزاعیؒ تین دن غائب رہنے کے بعد اس کے سامنے پیش ہو گئے۔ امام اوزاعیؒ کا خود بیان ہے کہ میں اس کے پاس اس حال میں پہنچا کہ وہ اپنے تخت پر براجمان تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں چھڑی تھی' اس کے دائیں بائیں حبشی فوجی کھڑے ہوئے تھے جن کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں۔ میں نے اس کو سلام کیا لیکن اس نے جواب نہ دیا اور اس نے اپنی چھڑی کو ہلاتے ہوئے کہا ''اے اوزاعی! تمہارا کیا خیال ہے ہم نے بنی اُمیہ کے

ظلم سے اس سرزمین کو پاک کر دیا ہے' بتاؤ یہ جہاد ہے یا نہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیئٍ مَا نَوٰی ، فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ، وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ))(۱۴)

''اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور بلاشبہ ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس نے ہجرت کی اللہ اور رسول کی طرف تو واقعی اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے اور جس نے ہجرت کی دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے شادی رچانے کے لیے تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف مانی جائے گی جس کا اس نے قصد کیا ہے''۔

یہ سن کر عبداللہ بن علی نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے اپنی چھڑی زمین پر ماری۔ آس پاس کے فوجیوں کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ تلواروں کے دستوں پر رکھ لیے۔ اس کے بعد اُس نے کہا ''اوزاعی! بنی اُمیہ کے خون کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' اوزاعی کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا:

((لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِیئٍ مُسْلِمٍ یَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ : اَلثَّـیِّبُ الزَّانِیْ وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالتَّارِکُ لِدِیْنِہٖ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَۃِ))(۱۵)

''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں' مگر تین وجوہ کی بنا پر: (۱) شادی شدہ بدکار (۲) جان کے بدلے جان (۳) اپنے دین کو چھوڑ دینے والا' جماعت سے الگ ہو جانے والا (یعنی مرتد)''۔

اُس نے اپنی چھڑی کو پہلے سے بھی زیادہ زور سے ہلاتے ہوئے کہا کہ بنی اُمیہ کے مال و دولت کے بارے میں جو کہ ان سے چھینی گئی ہے' تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے جواب میں کہا اگر یہ مال ان کے ہاتھوں میں حرام طریقے سے آیا تھا تو تمہارے لیے بھی حرام ہے اور اگر انہوں نے حلال طریقہ سے حاصل کیا تھا تو تمہارے لیے بھی اُسی وقت حلال ہو سکتا ہے جب تم اسے جائز طریقے سے حاصل کرو۔

اس نے پوری شدت سے پھر اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے کہا کیا ہم تمہیں قاضی بنا دیں؟

میں نے جواب میں کہا ''تمہارے آباء واجداد نے کبھی مجھے اس مشقت میں نہیں ڈالا اور میں چاہتا ہوں کہ اس احسان کو تکمیل تک پہنچایا جائے جس کی ابتدا تمہارے بزرگوں نے کی تھی''۔ عبداللہ بن علی نے کہا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے چھٹی مل جائے۔ میں نے جواب دیا: ''ہاں' میں اب رخصت ہونا چاہتا ہوں! میرے اہل وعیال میرے انتظار میں ہیں' وہ اپنی ضروریات کے لیے میرے محتاج ہیں' اُن کے دل میری تاخیر کی وجہ سے بے چین ہوں گے''۔ امام اوزاعیؒ کا بیان ہے کہ میں اب اس انتظار میں تھا کہ میرا سرتن سے جدا ہو جائے' لیکن نامعلوم کیا بات ہوئی کہ اُس نے مجھے واپس لوٹنے کی اجازت دے دی۔(۱٦)

(۱۰) خلیفہ ابوجعفر منصور نے ایک مرتبہ عبداللہ بن طاؤسؒ کو بلایا جو اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ امام مالکؒ اور ابن طاؤسؒ دونوں جب اس کے پاس پہنچے تو کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے سوال کیا ''اے ابن طاؤسؒ! کوئی ایسی حدیث سناؤ جسے تمہارے باپ طاؤس نے روایت کیا ہو؟'' ابن طاؤس نے کہا میرے والد نے مجھے حدیث بیان کی تھی کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکومت میں حصہ دار ٹھہرایا ہو اور اس نے انصاف کے بجائے لوگوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے ہوں۔ پھر کچھ دیر کے لیے رک گئے۔ امام مالک کا بیان ہے کہ میں نے اپنے کپڑے اس اندیشے سے سمیٹ لیے کہ کہیں اس کے خون سے آلودہ نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ابوجعفر نے کہا ''اے طاؤس کے بیٹے! مجھے کچھ نصیحت کر''۔ ابن طاؤس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۝٧ الَّتِىۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِى الۡبِلَادِ ۝٨ وَثَمُوۡدَ الَّذِيۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۝٩ وَفِرۡعَوۡنَ ذِى الۡاَوۡتَادِ ۝١٠ الَّذِيۡنَ طَغَوۡا فِى الۡبِلَادِ ۝١١ فَاَكۡثَرُوۡا فِيۡهَا الۡفَسَادَ ۝١٢ فَصَبَّ عَلَيۡهِمۡ رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ ۝١٣ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ۝١٤﴾ (الفجر)

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قومِ عاد (یعنی) قومِ ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ جن کے قد وقامت ستونوں جیسے (دراز) تھے' اور جن کے برابر زور وقوت میں دنیا بھر میں کوئی نہیں پیدا کیا گیا' اور قومِ ثمود جو وادی القریٰ میں چٹانیں تراشا کرتے تھے' اور میخوں والا فرعون' ان سب نے ملکوں میں سر اٹھایا تھا اور بہت زیادہ فساد برپا کیا تھا۔ آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ بے شک آپ کا رب

نافرمانوں کی گھات میں ہے۔''

امام مالکؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر پھر میں نے اپنا دامن سمیٹ لیا کہ خون کے چھینٹے مجھ پر نہ پڑ جائیں۔ منصور نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا ''مجھے یہ دوات دے دو''۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے دوبارہ کہا ''مجھے یہ دوات پکڑا دو'' لیکن ابن طاؤس یہ حکم بجا نہ لائے۔ منصور نے کہا ''اس دوات کو دینے سے کون سی چیز مانع ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تم اس دوات کی سیاہی سے کوئی ایسی گناہ کی بات نہ لکھ ڈالو جس بنا پر میں بھی تمہارا شریک کار ٹھہرا دیا جاؤں''۔ منصور نے جب یہ سنا تو غضب ناک ہو کر اس نے کہا تم دونوں میرے پاس سے چلے جاؤ۔ ابن طاؤس نے کہا ''ہماری بھی یہی خواہش ہے''۔(۱۷)

امام مالکؒ کہتے ہیں اس واقعہ سے میں ابن طاؤس کی فضیلت و عظمت کا قائل ہو گیا۔

(۱۱) قعقاع بن حکیم کا بیان ہے کہ میں ایک دن خلیفہ مہدی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اس دور کے بہت بڑے عالم سفیان ثوریؒ کو لایا گیا۔ انہوں نے دربار میں داخل ہو کر سلام کیا' یعنی سلام مسنون کے ذریعہ مخاطب کیا لیکن سلامِ خلافت (**السلام علیک یاخلیفة المسلمین**) کہنے سے پرہیز کیا۔ اس موقع پر مہدی کا وزیر ربیع تلوار پر ٹیک لگائے خلیفہ کے بازو میں کھڑا ہوا تھا اور اس کے حکم کا منتظر تھا۔ خلیفہ مہدی نے مسکراتے ہوئے سفیانؒ سے کہا کہ تم اِدھر اُدھر چھپے پھرتے ہو' تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر ہم تمہیں سزا دینا چاہیں تو ہم تمہیں اپنی گرفت میں نہیں لے سکیں گے' اب بولو! اب تو تم ہماری گرفت میں آ گئے ہو۔ کیا تمہیں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ ہم جس طرح چاہیں اپنی خواہش کے مطابق تمہارے بارے میں فیصلہ کر ڈالیں؟ سفیان ثوریؒ نے جواب دیا: آپ اگر میرے بارے میں فیصلہ کریں گے' تو یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ کے بارے میں وہ ذات فیصلہ کرے گی جو قادر مطلق ہے' جس کے ہاں حق اور باطل کے درمیان پوری طرح فرق کر دیا جائے گا۔ ربیع نے خلیفہ سے کہا: امیر المؤمنین! کیا اس جاہل کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اس قسم کی گستاخانہ باتیں آپ کے سامنے کرے' آپ کی اجازت ہو تو میں اس کی گردن مار دوں۔ مہدی نے جواب میں کہا ''افسوس ہے تم پر' خاموش رہو' تمہارا ارادہ یہ ہے کہ ہم سفیان جیسی ہستی کو قتل کر کے بدبختی میں مبتلا ہو جائیں''۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ امام ثوری کو کوفہ کا قاضی بنا دیا جائے' اس بارے میں کسی قسم کی رکاوٹ برداشت نہیں کی جائے گی۔ یہ حکم لکھ کر امام ثوری کو دے دیا گیا۔ امام ثوری نے یہ خط لیا اور باہر نکل کر دجلہ کی موجوں کے حوالے کر دیا

اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کو ملک کے کونے کونے میں ڈھونڈا گیا لیکن وہ نہ مل سکے۔ ان کی جگہ شریک النخعی کو قاضی بنایا گیا۔(۱۸)

(۱۲) فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے گھر میں کپڑے اتار کر سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک زور دار دستک کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر کہا: من ھذا؟ (کون ہے یہ؟) دستک دینے والے نے کہا باہر آیئے' امیر المؤمنین تشریف لائے ہیں۔ میں اپنے کپڑوں میں اُلجھتے ہوئے دوڑ کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خلیفہ ہارون الرشید میرے دروازے پر کھڑے ہیں' چہرے پر فکر وغم کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے کہا اے امیر المؤمنین! آپ مجھے بلا لیتے تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا' آپ نے خواہ مخواہ یہاں آنے کی زحمت گوارا کی۔ خلیفہ نے جواب دیا ان باتوں کو چھوڑو' اصل معاملہ یہ ہے کہ آج رات کچھ ایسا خیال دل میں آیا کہ جس نے میری نیند اڑا دی اور دماغ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ کوئی ایسا عالم باعمل بتاؤ جس کے سامنے میں اپنی الجھن پیش کر سکوں۔ فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ میں خلیفہ کو لے کر اس وقت کے مشہور زاہد فضیل بن عیاضؒ کے پاس پہنچا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے حجرے میں نماز میں مشغول ہیں اور ان کی زبان پر یہ آیت ہے:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَمَمَاتُھُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الجاثیۃ)

''کیا مجرموں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر درجہ دیں گے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہیں' ان کی زندگی اور موت دونوں برابر شمار ہوں گی؟ کیا ہی برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں''۔

خلیفہ ہارون نے کہا اگر کسی شخص سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو وہ یہی بزرگ ہیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے جواب ملا کون؟ میں نے کہا امیر المؤمنین تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میرا ان سے کیا تعلق؟ میں نے کہا' سبحان اللہ! کیا آپ پر اُن کی اطاعت فرض نہیں ہے؟ فضیل بن عیاضؒ نے جواب دیا: کیا یہ آنحضورﷺ کی حدیث نہیں ہے:

((لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یَذِلَّ نَفْسَہٗ)) (۱۹)

''مؤمن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔''

پھر وہ اپنے بالا خانے سے اترے اور دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں واپس چلے گئے اور

چراغ بجھا کر کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ان کو ٹٹولنے لگے' مجھ سے پہلے خلیفہ ہارون الرشید کا ہاتھ فضیل بن عیاض تک پہنچ گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا: کیا نرم و نازک ہتھیلی ہے اگر اللہ کے عذاب سے نجات پا جائے!

فضل بن ربیع نے کہا میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آج ایک پارسا دل سے پاکیزہ کلام سنیں گے۔ خلیفہ نے فضیل بن عیاض کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: جس غرض کے لیے ہم آئے ہیں اُس کے بارے میں کچھ بات کیجیے' اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ فضیل نے کہا آپ کس کام کے لیے آئے ہیں؟ آپ کا تو یہ حال ہے کہ رعیت کے گناہ آپ نے اپنے اوپر لاد لیے ہیں' آپ نے اور آپ کے مقرب افسروں نے اس رعیت کو ذلت و رسوائی کا عذاب چکھایا ہے۔ ان کے گناہوں کی سزا ابھی آپ کو ملے گی' کیونکہ آپ ہی کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا میں فساد برپا کیا اور آپ ہی کے سہارے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ لیکن یہی لوگ قیامت کے دن آپ کو سب سے زیادہ ناپسند کریں گے' سب لوگوں سے پہلے آپ سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے۔ حساب کے دن اگر آپ اُن سے یہ مطالبہ کریں گے کہ آپ کے گناہ کا بوجھ وہ اٹھا لیں تو وہ کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے۔ جو شخص آج جس قدر محبّ ہے وہ اسی قدر قیامت کے روز آپ سے دور بھاگے گا۔ فضیل بن عیاض نے کہا: عمر بن عبدالعزیز کو جب خلافت کا منصب سونپا گیا تو انہوں نے اپنے زمانے کے تین نیک علماء (سالم بن عبداللہ' محمد بن ابی کعب اور رجاء بن حیات) کو بلایا۔ ان سے عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا ''میں اس آزمائش میں پھنس گیا ہوں' مجھے مشورہ دو۔''

عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوال کے جواب میں تینوں احباب نے باری باری کہا:

(۱) سالم بن عبداللہ بولے ''اگر آپ کل نجات کے متمنی ہیں تو اس دنیا سے روزہ رکھ لیجیے یعنی دنیا کی ہوس سے پرہیز کیجیے اور اس روزے کو موت کے پیالے سے افطار کیجیے''۔

(۲) محمد بن کعب نے کہا: ''اگر تم نجات چاہتے ہو تو تمہارا فرض ہے کہ جو مسلمانوں میں سن رسیدہ ہیں ان کو بمنزلہ باپ کے سمجھو' جو درمیانی عمر کے ہیں ان سے بیٹوں جیسا برتاؤ رکھو''۔

(۳) رجاء بن حیات نے کہا: ''اگر تم کل کے عذاب سے نجات کی تمنا رکھتے ہو تو عام مسلمانوں کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اور ان کے لیے وہی چیز ناپسند کرو جو تم اپنے لیے ناپسند رکھتے ہو۔ (پھر اسی حال میں تمہارا خاتمہ ہو جائے کوئی پرواہ نہیں)

فضیل نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''عمر بن عبدالعزیز نے منصب خلافت کو ایک آزمائش اور مصیبت قرار دیا اور آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ اے ہارون! مجھے اس دن کا بہت ہی ڈر ہے جس دن لوگوں کے قدم پھسل جائیں گے۔'' یہ سن کر خلیفہ ہارون الرشید پر رقت طاری ہوگئی اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

اس موقع پر فضل بن ربیع نے کہا ''امیر المؤمنین پر رحم کیجیے''۔ فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا: ''تم اور تمہارے ساتھی تو اس کی تباہی کا سامان کر رہے ہو اور تم مجھ سے رحم کی درخواست کرتے ہو''۔ اس کے بعد خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے حسین وجمیل چہرے والے! تو ہی وہ شخصیت ہے جس سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی مخلوق کے بارے میں باز پرس کرے گا' اگر تم اُس دن اپنے چہرے کو اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہو تو بچا لو۔ سنو! کبھی ایسا نہ ہو کہ تم صبح و شام اس حالت میں گزارو کہ تمہارے دل میں اپنی رعایا میں سے کسی کی طرف سے کھوٹ ہو۔ اس لیے کہ نبی اکرمﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنی رعایا سے خیانت کی' ان سے کینہ رکھا' وہ جنت کی مہک بھی نہیں پائے گا''۔ ہارون الرشید زار وقطار رونے لگا۔ آخر میں خلیفہ نے فضیل سے کہا ''کیا آپ پر کوئی قرض ہے؟'' فضیل نے کہا: ''ہاں! میرے رب کا مجھ پر قرض ہے' جس کا اس نے اب تک حساب نہیں لیا ہے۔ میرے لیے تباہی ہے اگر میرے ربّ نے مجھ سے پوچھ گچھ کی' میرے لیے بربادی ہے اگر اس نے مجھ سے باز پرس کی۔ میرے لیے ہلاکت ہے اگر میرے دل میں اُس دن کوئی دلیل یا عذر نہ ہوا۔ ہارون الرشید نے کہا: ''میرا اس سوال سے مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں سے آپ پر کسی کا قرض ہے تو بتائیے''۔ فضیل نے جواب دیا کہ مجھے میرے رب نے اس کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس کا تو ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿٥٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''میں نے جن وانس کو نہیں پیدا کیا مگر عبادت کے لیے۔ میں ان سے رزق کا طالب نہیں ہوں اور نہ ان سے چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ وہی رازق ہے' قوی وزبردست''۔

ہارون الرشید نے کہا ''یہ ہزار دینار ہیں ان کو اپنے اہل وعیال میں خرچ کیجیے اور اُن سے عبادت کے لیے اپنے اندر قوت پیدا کیجیے۔ فضیل نے کہا: سبحان اللہ! میں آپ کو نجات کا

راستہ بتاتا ہوں اور آپ مجھے یہ معاوضہ دے رہے ہیں! فضل بن ربیع کا بیان ہے کہ ہم ان کے مکان سے باہر نکلے تو خلیفہ ہارون نے کہا ''آئندہ جب کبھی ضرورت پیش آئے تو اس قسم کے عالم کے پاس مجھے لے جانا' یہ شخص تو اس دور میں مسلمانوں کا سردار گل سرسبد ہے''۔

واقعی ایسا شخص مسلمانوں کا سردار نہ ہو تو اور کون ہوگا۔ انہی بزرگ کا قول ہے کہ ''اگر علماء دنیا سے بے رغبت ہو جائیں تو بڑے بڑے سرکش' جباران کے قدموں کو چوم لیں۔ یہ وہ شخصیت ہے جس کے پاس خلیفۂ وقت نصیحت طلب کرنے کے لیے حاضر ہوا' روتے ہوئے اس کی باتیں سنیں اور شکرگزار ہو کر ان کے پاس سے اپنے گھر لوٹا۔

(۱۳) خلیفہ ابوجعفر منصور کے پاس جلیل القدر عالم سفیان ثوریؒ لائے گئے۔ خلیفہ نے ان سے کہا کوئی ضرورت ہو تو پیش کیجیے۔ انہوں نے جواب دیا اِتَّقِ اللّٰہَ (اللہ سے ڈر) تم نے خدا کی زمین کو ظلم وستم سے بھر دیا ہے۔ خلیفہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر دوبارہ اس نے یہی سوال کیا۔ امام ثوری نے جواب میں کہا کہ تمہیں یہ خلافت کا منصب مہاجرین وانصار کی تلواروں کی وجہ سے ملا ہے' آج ان کی اولاد بھوکوں مر رہی ہے' اللہ سے ڈر اور ان کے حقوق ادا کر! منصور نے پھر سر جھکا لیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر یہی سوال دہرایا کہ کوئی ضرورت ہو تو پیش کیجیے۔ لیکن سفیان ثوریؒ (شانِ بے نیازی کے ساتھ) دربار سے نکل آئے اور اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

(۱۴) خلیفہ سلیمان بن عبدالملک مکہ مکرمہ کا قصد کرتے ہوئے جب مدینہ منورہ پہنچا تو اس نے وہاں کے جلیل القدر عالم ابوحازم کو بلا بھیجا۔ ابوحازم جب تشریف لائے تو خلیفہ سلیمان اور ان کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی:

خلیفہ سلیمان: کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟

ابوحازم: اس لیے کہ تم نے اپنی آخرت ویران کر دی ہے اور اپنی دنیا آباد کر لی ہے' اس لیے تم آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہوتے ہوئے گھبراتے ہو۔

خلیفہ سلیمان: اے ابوحازم! اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کی کیا شکل ہوگی؟

ابوحازم: امیر المؤمنین! نیک کردار والا انسان خدا کے ہاں اس طرح حاضر ہوگا جیسے کوئی مسافر اپنے گھر پہنچتا ہے۔ رہا نافرمان' تو اس کی مثال اس بھگوڑے غلام کی سی ہے جو اپنے آقا کی طرف پلٹتا ہے۔ یہ سن کر خلیفہ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

خلیفہ سلیمان: کاش میں جانتا کہ خدا کے ہاں میرے لیے کیا طے ہوا ہے۔

ابوحازم: اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی کتاب پر پیش کیجیے۔ یعنی اپنے اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ لیجیے۔ اس کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ﴿۱۴﴾﴾ (الانفطار) ''بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بدکردار جہنم میں ہوں گے۔''

خلیفہ سلیمان: اللہ کی رحمت کہاں ہے؟

ابوحازم: نیک لوگوں کی صحبت میں۔

خلیفہ سلیمان: اللہ تعالیٰ کے کون سے بندے زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہیں؟

ابوحازم: نیکی اور تقویٰ والے۔

خلیفہ سلیمان: کون سا عمل افضل ہے؟

ابوحازم: حرام سے بچتے ہوئے فرائض کی پابندی۔

خلیفہ سلیمان: کونسی بات زیادہ قابل سماعت ہے؟

ابوحازم: جس شخص سے تم خوف کھاتے ہو اور امید رکھتے ہو' اُس کے سامنے حق بات کا اظہار۔

خلیفہ سلیمان: کون سا مسلمان زیادہ خسارے میں ہے؟

ابوحازم: ایسا شخص جو اپنے ظالم بھائی کی خواہش کو پورا کرتا ہے' اس طرح وہ دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت بیچ ڈالتا ہے۔

خلیفہ سلیمان: ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ابوحازم: مجھے اس سوال کا جواب دینے سے معافی دیجیے۔

خلیفہ سلیمان: جواب دیجیے اور ضرور دیجیے' اس جواب میں بہرحال میرے لیے کوئی نہ کوئی نصیحت پوشیدہ ہوگی۔

ابوحازم: تمہارے آباء واجداد نے تلوار کے ذریعے لوگوں پر غلبہ پایا اور مسلمانوں کے مشورے اور خوشنودی کے بغیر ان کے ملک کو ہتھیا لیا' انہوں نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ تمہارے بزرگ تو چل بسے' کاش تم جانتے انہوں نے کیا کچھ کہا اور کیا کچھ ان کے بارے میں کہا گیا۔ اس فیصلہ پر خلیفہ کے ایک ہم نشین نے کہا ''آپ

کی یہ بات انتہائی نامناسب ہے''۔ ابوحازم نے جواب دیا ''اللہ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ حق کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کریں گے' چھپائیں گے نہیں''۔

حواشی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب افضل الجھاد۔
(۲) سنن النسائی' کتاب البیعۃ' باب افضل من تکلم بالحق عند امام جائر۔ ومسند احمد' کتاب اول مسند الکوفیین' باب حدیث طارق بن شھاب۔
(۳) تحفۃ الاحوذی' ج۳' ص ۲۱۰۔
(٤) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب قول النبیﷺ انابك لمحزونون۔ وصحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب رحمۃ الصبیان ......
(٥) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب قول النبیﷺ یعذب المیت ......وصحیح مسلم' کتاب الجنائز' باب البکاء علی المیت۔
(٦) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال' وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔
(۷) العدالۃ الاجتماعیہ' السید قطب۔
(۸) احیاء العلوم' الغزالی' ج۵' ص ۷۰۔
(۹) سراج الملوك' ص ۵۱' شرح مسند احمد از احمد محمد شاکر۔
(۱۰) مجلہ الزھر' رمضان ۱۹۵۱ء واخلاقنا الاجتماعیۃ السباعی۔
(۱۱) قلائد الجواھر' ص ۸۔
(۱۲) مختصر منھاج السنۃ' ذھبی' ص ۲۳۲۔
(۱۳) احیاء العلوم' ج۷۔
(١٤) متفق علیہ' وسنن ابی داؤد کتاب الطلاق' باب فیما عنی بہ الطلاق والنیات' واللفظ لہ۔
(١٥) صحیح البخاری' کتاب الدیات' باب قول اللہ تعالی النفس بالنفس والعین بالعین۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات' باب ما یباح بہ دم المسلم' واللفظ لہ۔
(١٦) مجلۃ العربی' عدد ۷۱' ١٩٦٤ء۔
(١٧) مجلۃ العربی' عدد ۷۱' ١٩٦٤ء۔
(١٨) تذکرۃ الحفاظ' ج۱۔
(١٩) سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب النھی عن سب الریاح۔

[یہ مضمون میثاق شمارہ ستمبر۔ اکتوبر و نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا]

''لھوالحدیث'' کا مفہوم
ایک تفسیری جائزہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

لھو اور حدیث کے الفاظ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں' مگر لھو کے سابقہ کے ساتھ 'لھو الحدیث' کی ترکیب صرف ایک ہی مقام پر سورۂ لقمان کی آیت ۶ میں استعمال ہوئی ہے۔ یہاں دو لفظوں کا یہ مرکب کتاب حکیم کی آیات کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ محسنین کے ذکر کے بعد ان اشقیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آیاتِ الٰہی سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے گمراہ کن باتیں پھیلاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ٭ۖ وَّ یَتَّخِذَہَا ہُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۶﴾﴾ (لقمٰن)

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں کہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو راہِ الٰہی سے بہکائیں اور اسے ہنسی بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والے عذاب ہیں۔''

یہ ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھیؒ کا ہے۔ اب دوسرے تراجم بھی ملاحظہ فرمائیں:

☆ ''اور ایک وہ لوگ ہیں جو خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تاکہ بچلائیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے اور ٹھہرائیں اس کو ہنسی۔ وہ جو ہیں ان کو ذلت کا عذاب ہے''۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ)

☆ ''اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے''۔ (ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

☆ ''اور کوئی ایسے لوگ بھی ہیں جو بیوپار کرتے ہیں (مقصدِ حیات سے) غافل کر دینے والی باتوں کا تاکہ بھٹکاتے رہیں راہ خدا سے (اس کے نتائج بد سے) بے خبر ہو کر اور اس کا مذاق اڑاتے رہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے''۔ (ترجمہ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

☆ ''اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فضولیات کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کریں بغیر کسی علم کے اور ان آیات کا مذاق اڑائیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے''۔ (ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

☆ ''اور کوئی انسان ایسا بھی ہے جو اللہ سے غافل کر دینے والی باتیں خریدتا ہے تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے (دوسروں کو) گمراہ کرے اور اس راہ کی ہنسی اڑائے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔'' (ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

☆ اور لوگوں میں سے بعض ایسا ہے جو بے ہودہ حکایتیں خریدتا ہے تاکہ (لوگوں کو) بے سمجھے خدا کے رستے سے گمراہ کرے اور اس سے استہزا کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا''۔ (ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھریؒ)

مذکورہ بالا تمام تر تراجم میں ''**لھو الحدیث**'' کے ترجمہ میں الفاظ کا تنوع موجود ہے' مگر مفہوم میں یکسانیت ہے۔ لغویت' بے ہودگی' فضولیت اور تغافل کا مفہوم سب میں مشترک ہے۔ اب ہم پہلے تو **لھو الحدیث** کی ترکیب میں لھو اور حدیث کا لغوی مفہوم واضح کریں گے اور پھر متذکرہ مفسرین کے اس ضمن میں تفسیری نوٹس پیش کریں گے۔

''**اللَّھوُ**'' ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے۔ یہ **لَھَوْتُ بِکَذَا** اور **لَھَیْتُ عَنْ کَذَا** سے اسم ہے' جس کے معنی کسی مقصد سے ہٹ کر بے سود کام میں لگ جانے کے ہیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿**اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ**......﴾ (الحدید:۲۰) ''جان رکھو کہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے......'' پھر ہر وہ چیز جس سے کچھ لذت اور فائدہ حاصل ہوا سے بھی ''لھو'' کہہ دیا جاتا ہے' چنانچہ قرآن مجید میں ہے: ﴿**لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَھْوًا لَّاتَّخَذْنٰـہُ مِنْ لَّدُنَّا**﴾ (الانبیاء:۱۷) ''اگر ہم چاہتے کہ کھیل بنائیں تو ہم اپنے پاس سے بنا لیتے''۔ اور جن مفسرین نے یہاں لھو سے مراد عورت یا اولاد لی ہے انہوں نے دنیاوی آرائش کی بعض چیزوں کی تخصیص کی ہے جو لہو ولعب بنائی گئی

ہیں۔ محاورہ ہے: **الھاہ کذا** یعنی اسے فلاں چیز نے اہم کام سے مشغول کر دیا۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿**اَلۡهٰـكُمُ التَّـكَاثُرُ**﴾ (التکاثر) ''لوگو تم کو کثرت مال و جاہ و اولاد کی خواہش نے غافل کر دیا''۔ نیز فرمایا: ﴿**رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ**﴾ (النور:۳۷) ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت''۔ ﴿...... **لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ**﴾ (الانبیاء:۳) ''ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں''۔ یعنی دل غافل ہو کر بے کار کاموں میں مشغول ہیں۔ (مفردات القرآن' جلد دوم)

لھو کے معنی کھیل کود' بہلاوا' غافل کر دینے والی چیز' بیوی' اولاد اور ڈھولکی کے ہیں۔ (فیروز اللغات' عربی اردو)

اس ترکیب میں دوسرا لفظ **حدیث** ہے۔ ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعے پہنچے اسے **حدیث** کہا جاتا ہے' عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿**وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِىُّ اِلٰى بَعۡضِ اَزۡوَاجِهٖ حَدِيۡثًا**﴾ (التحریم:۳) ''اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے بھید کی بات کہی''۔ ﴿**وَعَلَّمۡتَنِىۡ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ**﴾ (یوسف:۱۰۱) میں احادیث سے رؤیا مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے' چنانچہ فرمایا: ﴿**فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ**﴾ (الطور) ''تو اس جیسا کلام بنا لائیں اگر یہ سچے ہیں''۔ ﴿**فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا**﴾ (النساء) ''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟''۔ ﴿**فَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ**﴾ (سبا:۱۹) ''تو ہم نے (انہیں نابود کر کے) ان کے افسانے بنا دیئے''۔ یعنی ان کی داستانیں ہی باقی رہ گئی ہیں جو بطورِ مثال ذکر کی جاتی ہیں۔ (مفردات القرآن' جلد اوّل)

حدیث کے معنی بات' خبر اور روایت کے ہیں (فیروز اللغات' عربی اردو)۔ مختصراً یہاں **لھو الحدیث** میں لفظ **حدیث** سے مراد باتیں' قصہ کہانیاں اور داستانیں ہیں۔ سید مودودی **لھو الحدیث** کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یعنی ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے۔ لغت کے اعتبار سے تو ان الفاظ میں کوئی ذم کا پہلو نہیں ہے' لیکن استعمال میں ان کا اطلاق بری' فضول اور بے ہودہ باتوں پر ہی ہوتا ہے' مثلاً گپ' خرافات' ہنسی مذاق' داستانیں' افسانے اور ناول' گانا بجانا اور اس طرح کی دوسری چیزیں''۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم)

علامہ آلوسی نے **اسباب النزول للواحدی** کے حوالے سے اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے اس آیۂ کریمہ کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب کفارِ مکہ کی تمام تر کوششوں اور مزاحمتوں کے باوجود نبی کریمﷺ کی دعوت پھیلتی چلی جا رہی تھی اور قرآن مبین کا حسن اعجاز لوگوں کے دلوں کو موہ رہا تھا تو نضر بن حارث جو شیاطینِ قریش میں سے تھا اور حضور اکرمﷺ کو اذیت دینے میں پیش پیش تھا' اس نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا: ''اے گروہ قریش! واللہ تمہارے آگے ایک بڑا اہم معاملہ پیش ہے' تمہارے پاس اس کے مقابلے کے لیے اب کوئی تدبیر نہیں ہے۔ محمد (ﷺ) کی تم میں یہ حالت تھی کہ وہ ایک نوعمر لڑکا تھا' تم سب میں زیادہ پسندیدہ اور گفتگو کے لحاظ سے تم سب میں زیادہ سچا' تم سب میں زیادہ امانت دار۔ یہاں تک کہ تم نے اس کی زلفوں میں بڑھاپے کے آثار دیکھے اور وہ تمہارے پاس ایک چیز لایا تو تم نے اس کو جادوگر قرار دیا۔ واللہ وہ جادوگر نہیں' ہم نے جادوگروں کی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے دیکھے ہیں۔ تم نے کہہ دیا کہ وہ کاہن ہے۔ نہیں واللہ وہ کاہن بھی نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کی حرکتیں دیکھی ہیں اور ان کی قافیہ پیمائی سنی ہے۔ تم نے کہہ دیا کہ وہ شاعر ہے۔ نہیں واللہ وہ شاعر بھی نہیں' ہم نے شاعر دیکھے ہیں اور شعر کی تمام قسمیں ہزج و رجز' سنی ہیں۔ تم نے کہہ دیا کہ وہ دیوانہ ہے۔ نہیں واللہ وہ دیوانہ بھی نہیں' ہم نے دیوانگی بھی دیکھی ہے۔ نہ وہ اختناقی حالت ہے اور نہ دیوانگی کی بے سروپا گفتگو ہے' نہ جنونی ہذیان۔ اے گروہِ قریش! تم اپنی حالت پر غور کر لو' واللہ تمہارے سامنے ایک مہتم بالشان معاملہ پیش ہے۔''

نضر بن حارث مقامِ حیرہ کو بھی گیا تھا اور وہاں ایرانی بادشاہوں کے واقعات اور رستم و اسفندیار کے حالات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب رسول اللہﷺ کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور اس میں اپنی قوم کو اللہ کی یاد دلاتے اور ان کو ان سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی ان آفتوں سے ڈراتے جو ان پر عذابِ الٰہی کی وجہ سے نازل ہوئیں تو آپؐ کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد آپؐ کی جگہ پر بیٹھ جاتا اور کہتا اے گروہِ قریش! واللہ میں اس سے بہتر باتیں بیان کرنے والا ہوں۔ پس میرے پاس آؤ' میں تم سے اس کی باتوں سے بہتر باتیں بیان کرتا ہوں۔ وہ ان سے ایرانی بادشاہوں اور رستم و اسفندیار کے قصے بیان کرتا اور پھر کہتا (بتاؤ تو) کون سی بات محمد (ﷺ) نے مجھ سے بہتر بیان کی؟'' (سیرت ابن ہشام جلد اوّل مترجم مولانا قطب الدین احمد محمودی)

صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں: ''اور ابن عباسؓ نے اس پر مزید اضافہ کیا ہے کہ نضر بن حارث نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی مکرمﷺ کی باتوں سے متأثر ہو رہا ہے اس پر ایک لونڈی مسلط کر دیتا اور اسے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا' گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل ادھر سے ہٹ جائے۔ یہ قریب قریب وہی چال تھی جس سے قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام لیتے رہے ہیں' وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص و سرود (کلچر) میں غرق کر دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انہیں سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے اور اس عالم مستی میں ان کو سرے سے محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ انہیں کس تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے''۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ رقم طراز ہیں: ''قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ میں تمام ایسے کاموں سے اجتناب کی بار بار تاکید کی گئی ہے جو لغو اور لایعنی ہوں۔ اس آیت طیبہ میں اسی قسم کا تاکیدی فرمان ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے لہوالحدیث کی یہ تفسیر نقل کی ہے: **كُلُّ مَا شَغَلَكَ عَنْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَذِكْرِهٖ مِنَ السَّمَرِ وَالْاَضَاحِيْكِ وَالْخُرَافَاتِ وَالْغِنَاءِ وَنَحْوِهَا** (روح المعانی) یعنی ہر وہ بات لہوالحدیث ہے جو تجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر سے غافل کر دے۔ رات گئے تک قصہ گوئیاں' ہنسانے والے چٹکلے' ہر طرح کے خرافات' گانا بجانا وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ بے شک ہر وہ چیز جو عبادتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی سے محرومی کا باعث ہو اسلام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں''۔ (ضیاء القرآن' جلد سوم)

صاحبِ معارف القرآن فرماتے ہیں: ''آیت مذکورہ میں لہوالحدیث کے معنی اور تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود' ابن عباس و جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں اس کی تفسیر گانے بجانے سے کی گئی ہے (رواہ الحاکم وصححہ والبیھقی فی الشعب وغیرہ) اور جمہور صحابہ و تابعین اور عام مفسرین کے نزدیک لہوالحدیث عام ہے تمام ان چیزوں کے لیے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈالے۔ اس میں غناء مزامیر بھی داخل ہے اور بے ہودہ قصے کہانیاں بھی۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب الادب المفرد اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں لہوالحدیث کی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ اس میں فرمایا ہے کہ **لھو الحدیث ھو الغناء واشباھه** یعنی لہوالحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں (جو اللہ کی عبادت سے غافل کر دیں) اور سنن بیہقی میں ہے کہ **اشتراء لھو الحدیث** سے

مراد گانے بجانے والے مرد یا عورت کو خریدنا یا اس کے امثال ایسی بے ہودہ چیزوں کو خریدنا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کریں۔ ابن جریر نے بھی اس عام معنی کو اختیار فرمایا ہے (روح ملخصاً)۔ اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی عموم ثابت ہوتا ہے جس میں آنحضرتﷺ کا ارشاد ہے کہ گانے والی لونڈیوں کی تجارت نہ کرو اور پھر فرمایا: **وفی مثل هذا انزلت هذه الآية ومن الناس يشترى الخ**''۔ (معارف القرآن' جلد ہفتم)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لہو الحدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ''**لهو الحديث** اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے مقام میں **زُخرُف القَول** کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ لفظ کتاب حکیم کی آیات کے مقابل استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس سے مراد وہ گمراہ کن باتیں ہیں جو وقت کے مفسدین لوگوں کو آیاتِ الٰہی سے برگشتہ کرنے کے لیے پھیلاتے تھے۔ قرآن لوگوں کو زندگی کے اصل حقائق کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن مخالفین کی کوشش یہ تھی کہ لوگ ان ہی مزخرفات میں پھنسے رہیں جن میں پھنسے ہوئے ہیں''۔ (تدبر قرآن' جلد ششم)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مذکورہ آیت میں لہو الحدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: ''سعدائے مفلحین کے مقابلہ میں یہ ان اشقیاء کا ذکر ہے جو اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے قرآن کریم کو چھوڑ کر ناچ رنگ' کھیل تماشے یا دوسری واہیات وخرافات میں مستغرق ہیں۔ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان ہی مشاغل وتفریحات میں لگا کر اللہ کے دین اور اس کی یاد سے برگشتہ کر دیں اور دین کی باتوں پر خوب ہنسی مذاق اڑائیں...... (تنبیہہ) شانِ نزول گو خاص ہو مگر عموم الفاظ کی وجہ سے حکم عام رہے گا۔ جو لہو (شغل) دین اسلام سے پھر جانے یا پھیر دینے کا موجب ہو حرام بلکہ کفر ہے۔ اور جو احکامِ شرعیہ سے باز رکھے یا سبب معصیت بنے وہ معصیت ہے۔ ہاں جو لہو کسی امر واجب کا مفوِّت (فوت کرنے والا) نہ ہو اور کوئی شرعی غرض و مصلحت بھی اس میں نہ ہو وہ مباح' لیکن لایعنی ہونے کی وجہ سے خلافِ اولیٰ ہے۔ گھوڑ دوڑ یا تیراندازی اور نشانہ بازی یا زوجین کی ملاعبت (جو حد شریعت میں ہو) چونکہ معتدبہ اغراض و مصالح شرعیہ پر مشتمل ہیں' اس لیے لہو باطل سے مستثنیٰ قرار دی گئی ہیں''۔ (تفسیر عثمانی)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لہو الحدیث کی توضیح یوں کرتے ہیں: ''لہو الحدیث۔ مراد اس سے عموماً غنا (موسیقی) سمجھی گئی ہے۔ **وفی الآية عند اكثرين ذم للغناء باعلىٰ صوت**

(روح) **الغناء فی قول ابن عباس وابن مسعود وغیرھا وھو ممنوع بالکتاب والسنة** (قرطبی)...... گویا ہر بے کار‘ غیر مفید مشغلہ اس کے تحت داخل ہے جو حق کی طرف سے غفلت اور بے رغبتی پیدا کرنے والا ہو۔ **ما یلھی عما یعنی کالاحادیث التی لا اصل لھا والاساطیر التی لا اعتبار بھا والمضاحک وفضول الکلام** (بیضاوی) **لھوالحدیث**۔ غنا کے باب میں محدثین وفقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ جو گانا محض دل بہلانے یا با اصطلاح فقہاء دفع وحشت نفس کے لیے ہو‘ اس میں مضائقہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک بھی نہیں۔ درمختار میں اسے سرخسی‘ عینی وعنایہ کے حوالہ سے جائز رکھا ہے **وفی الدر مختار التغنی لنفسه لدفع الوحشیة لا بأس به عند العامة علی ما فی العنایة وصححه العینی والیه ذهب شمس الائمه السرخسی** (روح) اگر اس میں کلام حکیمانہ اور مضامین اخلاق ومعرفت کے ہوں جب تو بالکل ہی جائز ہے **قال ولو فیه وعظ وحکمة فجائز اتفاقًا** (روح) لیکن جو گانا لوگوں کو سنانے کے لیے جشن عقد اور عید وغیرہ کے علاوہ ہو‘ خصوصاً قوالی کی محفلیں مسجدوں اور خانقاہوں میں مجمع فساق کے ساتھ ہوا کرتی ہیں اور جنہیں عبادت سمجھا جاتا ہے وہ تو اور زیادہ قابل ملامت ہیں...... بلکہ اس تواجد وتراقص کا شمار علاماتِ زندقہ سے کیا گیا ہے اور اس کا جائز سمجھنا حدود کفر میں داخل ہو جاتا ہے‘‘۔ (تفسیر ماجدی)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ’’جو کام حقیقتاً لہو ہوں یعنی جن میں نہ کوئی دینی فائدہ ہو نہ دُنیوی وہ سب کے سب مذموم اور مکروہ تو ضرور ہی ہیں۔ پھر ان میں تفصیل ہے۔ بعض تو کفر کی حد تک پہنچ جاتے ہیں‘ بعض حرام صریح ہیں‘ اور کم سے کم درجہ مکروہ تنزیہی‘ یعنی خلافِ اولیٰ ہونے کا ہے...... مذموم اور ممنوع وہ لہو اور کھیل ہیں جن میں کوئی دینی و دنیوی فائدہ نہیں۔ جو کھیل بدن کی ورزش‘ صحت اور تندرستی باقی رکھنے کے لیے یا کسی دینی و دنیوی ضرورت کے لیے یا کم از کم طبیعت کا تکان دور کرنے کے لیے ہوں اور ان میں غلو نہ کیا جائے...... ایسے کھیل شرعاً مباح‘ اور دینی ضرورت کی نیت سے ہوں تو وہ ثواب بھی ہیں...... صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انصارِ مدینہ میں ایک صاحب دوڑ میں بڑے ماہر تھے‘ کوئی ان سے سبقت نہ لے جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک روز اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرے؟ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی کہ میں مقابلہ کروں۔ آپؐ نے اجازت دے دی تو میں مقابلہ میں آگے بڑھ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیادہ دوڑ کی

مشق کرنا بھی جائز ہے ---- ایک مشہور پہلوان رکانہ نے رسول اللہﷺ سے کشتی ٹھہرائی تو آپؐ نے اس کو کشتی میں پچھاڑ دیا (ابو داوٗد فی المراسیل)۔ حبشہ کے کچھ نوجوان مدینہ طیبہ میں فنِ سپہ گری کی مشق کرنے کے لیے نیزوں وغیرہ سے کھیلتے تھے' رسول اللہﷺ نے ان کا کھیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی پشت کے پیچھے کھڑا کر کے دکھلایا اور ان لوگوں کو فرمایا: ((**اُلْهُوا وَالْعَبُوا**)) یعنی کھیل کود کرتے رہو! (رواہ البیھقی فی الشعب کذا فی الکنز من باب اللھو) اور بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((**فَاِنِّیْ اُکْرِہُ اَنْ یُّرٰی فِی دِیْنِکُم غِلْظَۃٌ**)) یعنی میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تمہارے دین میں خشکی اور شدت دیکھی جائے''۔ بعض صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ جب وہ قرآن و حدیث کے مشاغل میں تھک جاتے تو بعض اوقات عرب کے اشعار یا تاریخی واقعات سے دل بہلاتے تھے (ذکرہ عن ابن عباس فی کف الرعاع) ایک حدیث میں ارشاد ہے: ((**رَوِّہِ الْقُلُوبَ سَاعَۃً فَسَاعَۃً**)) (اخرجہ ابو داوٗد فی مراسیلہ عن ابن شھاب مرسلاً) یعنی تم اپنے قلوب کو کبھی کبھی آرام دیا کرو۔ جس سے قلب و دماغ کی تفریح اور اس کے لیے کچھ وقت نکالنے کا جواز ثابت ہوا...... بعض کھیل ایسے بھی ہیں جن کو حضورﷺ نے خاص طور پر منع فرمایا' مثلاً شطرنج' چوسر وغیرہ۔ اگر ان کے ساتھ ہار جیت اور مال کا لین دین ہو تو یہ جوا...... اور قطعی حرام ہیں...... اسی طرح کبوتر بازی کو بھی رسول اللہﷺ نے ناجائز قرار دیا''۔ (معارف القرآن' جلد ہفتم)

بکثرت جلیل القدر صحابہ اور تابعین نے لہوالحدیث کی تشریح غنا اور گانے بجانے سے کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لہوالحدیث سے کیا مراد ہے تو انہوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا: ''**هُوَ وَاللّٰهِ الْغِنا**'' خدا کی قسم اس سے مراد گانا ہے۔ گانا بالعموم منسلک ہوتا ہے گانے بجانے کے آلات سے' جن کے بارے میں حدیث نبویؐ ہے:

> عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ : ((**اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ بَعَثَنِیْ رَحْمَۃً وَهُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ' وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَمْحَقَ الْمَزَامِیْرَ وَالْکَبَّارَاتِ یَعْنِی الْبَرَابِطَ وَالْمَعَازِفَ وَالْاَوْثَانَ الَّتِیْ کَانَتْ تُعْبَدُ فِی الْجَاهِلِیَّۃِ**))
>
> (مسند احمد' ج۵' ص ۲۵۷)
>
> ''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے جہانوں کے لیے رحمت اور ہدایت بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ آلاتِ

موسیقی اوران بتوں کوتوڑ دوں‘ جن کی دورِ جاہلیت میں پوجاوعبادت کی جاتی تھی‘‘۔

سنن ترمذی میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میری اُمت کے لوگ جب پندرہ بری عادتیں اختیار کر لیں گے تو ان پر سرخ آندھی اور زمین میں دھنسنے یا شکلیں مسخ ہو جانے کا عذاب آئے گا۔ ان پندرہ کاموں میں سے ایک یہ بیان ہوا ہے: ((وَاتُّخِذَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ)) (سنن الترمذی‘ کتاب الفتن)

سنن ترمذی میں اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے‘ جس کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((...... وَظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ وَلَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَـهَا فَلْيَرْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِكَ رِيْحًا حَمْرَاءَ وَزَلْزَلَةً وَخَسْفًا وَمَسْخًا وَقَذْفًا وَآيَاتٍ تَتَابَعُ كَنِظَامٍ بَالٍ قُطِعَ سِلْكُهٗ فَتَتَابَعَ)) (سنن الترمذی‘ کتاب الفتن)

’’جب گانے والی عورتوں اور گانے بجانے کے آلات کا رواج عام ہو جائے۔ جب شرابیں پی جانے لگیں اور جب اس اُمت کے پچھلے لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں تو اُس وقت تم انتظار کرو سرخ آندھی کا‘ زلزلے کا‘ زمین میں دھنسنے کا‘ صورتیں بگڑ جانے کا اور قیامت کی ایسی نشانیوں کا جو یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے کسی ہار کی لڑی ٹوٹ جائے تو اس کے دانے یکے بعد دیگرے بکھر جائیں۔‘‘

حضور نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں علماء نے غنا کو ناجائز قرار دیا ہے‘ مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ لہوالحدیث کا لفظ خاص نہیں عام ہے‘ اس کے مفہوم کو غنا میں منحصر کرنا درست نہیں‘ اس لیے کہ ہر غنا حرام نہیں۔ اس سے انہوں نے سماع کا استثناء پیدا کیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے کہا: ’’اس غنا سے مراد وہ غنا ہے جو نفس کو حرکت دیتا ہے اور اسے ہوا و ہوس اور فسق و فجور پر برانگیختہ کرتا ہے۔ اس قسم کا غنا جس میں عورتوں کے حسن و جمال کا بیان ہو‘ جس میں شراب و دیگر محرمات کی تعریف ہو اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں‘ بالاتفاق یہ لہو مذموم ہے‘ لیکن وہ غنا جو اس قسم کی قباحتوں سے پاک ہو اس کا قلیل وقت کے لیے خوشی کے مواقع پر سننا جائز ہے‘ مثلاً شادی اور عید وغیرہ یا مشقت طلب کاموں کے دوران جوش دلانے کے لیے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی بحوالہ ضیاء القرآن) اس کے بعد علامہ قرطبی

نے صوفیاء کے سماع پر اپنی رائے ظاہر کی ہے''۔

حافظ ابن حجرؒ امام قرطبی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اس بارے میں صوفیاء نے جو بدعت ایجاد کی ہے تو یہ اس قبیل کی بدعت ہے جس کے حرام ہونے میں اختلاف نہیں کیا جا سکتا' لیکن نفسانی خواہشات نے بہت سے ان لوگوں پر غلبہ حاصل کر لیا ہے جس کی جانب نیکی اور خیر کی نسبت کی جاتی ہے (یعنی وہ بزرگوں کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں) ان میں سے ایک کثیر تعداد ان کی بھی ہے جن سے پاگلوں اور بچوں جیسی حرکات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ ناچنا شروع کر دیتے ہیں اور ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کی بے شرمی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے ان حرکات کو قربِ خداوندی کا ذریعہ اور اعمالِ صالحہ قرار دے دیا ہے اور ان کو بلند و بالا حال سمجھ لیا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ بلند و بالا حال نہیں ہے بلکہ برا حال ہے''۔(فتح الباری' ج۳' ص ۹۵' طبع مصر بحوالہ تفہیم المسائل جلد اوّل)

ظاہر ہے کہ صوفیاء کا عمل قرآن وسنت اور عمل صحابہؓ کے مقابلے میں حجت نہیں بن سکتا۔ شیخ القرآن مولانا گوہر رحمٰنؒ فرماتے ہیں: ''صوفیاء کے سماع میں صحیح قسم کا سماع بھی ہے اور غلط بھی۔ اس لیے اسے نہ مطلقاً جائز کہا جا سکتا ہے اور نہ مطلقاً ناجائز''۔ (تفہیم المسائل' جلد اول' ص۴۸۲)

البتہ خوش آوازی کے ساتھ مزامیر کے بغیر اشعار پڑھنا ممنوع نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ﴾ (الانفال:۶۵) ''اے نبیؐ! اہل ایمان کو (کفر کے مقابلے میں) جنگ کی ترغیب دلاؤ۔'' یعنی ان کے اندر جذبۂ جہاد اُبھارنے کی کوشش کرو۔ حضور نبی کریم ﷺ کے دور میں جہادی جذبوں کو مہمیز دینے کے لیے نظمیں بھی پڑھی گئی ہیں اور جنگی ترانے بھی سنائے گئے ہیں' لیکن ان میں مزامیر کے ذریعے موسیقی کی آمیزش ہرگز نہ تھی۔ سنن نسائی میں ہے کہ حضور ﷺ نے جہاد کے ایک سفر کے دوران عبداللہ بن رواحہ ؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کے اندر حرکت پیدا کرو۔ اس پر انہوں نے رجزیہ اشعار پڑھنے شروع کر دیے۔ کنز العمال میں ابونعیم اصفہانی کے حوالے سے روایت آئی ہے کہ:

کان البراء بن مالک حسن الصوت وکان یرجز رسول اللہ ﷺ فی اسفارہٗ براء بن مالک خوش آواز تھے اور رسول اللہ ﷺ کے سفر کے دوران رجزیہ اشعار پڑھا کرتے تھے''۔

غزوۂ خندق کے موقع پر خود رسول اللہ ﷺ نے یہ دعائیہ شعر پڑھا تھا: ؎

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ

فاغفر الانصار والمھاجرۃ

''اے اللہ! زندگی نہیں ہے مگر آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو انصار ومہاجرین کی مغفرت فرما!''

اس کے جواب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے درج ذیل جنگی ترانہ سنایا تھا:

نحن الذین بایعوا محمدًا

علی الجھاد ما بقینا ابدًا

(صحیح البخاری' باب غزوۃ خندق' کتاب المغازی)

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد ﷺ سے بیعت کی ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں جہاد کرتے رہیں گے''۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم المسائل' حصہ اول صفحہ ۴۵۲ تا ۴۵۹)

خوش آوازی کے ساتھ اشعار پڑھنے کا جواز اس صورت میں ہے کہ پڑھنے والی عورت یا اَمرد نہ ہوں اور اشعار کے مضامین فحش و بے ہودہ مضامین سے پاک ہوں۔

عہد حاضر میں ''لہوالحدیث'' کی مقبول ترین صورت ٹیلی ویژن ہے۔ اس سے اگرچہ دعوتِ دین' اشاعت علوم اور نشر اخبار جیسے مثبت کام بھی لیے جا رہے ہیں اور یہ جدید ترین وتازہ ترین سائنسی وعصری معلومات کا بیش بہا ذریعہ ہے' لیکن بنیادی طور پر اسے ایک ''ذریعۂ تفریح'' کی حیثیت حاصل ہے اور اس کے ذریعے ناظرین کی کثیر تعداد فلموں' ڈراموں اور دیگر فواحش سے حظ اٹھاتی ہے۔ مزید برآں انٹرنیٹ اور موبائل فون کا غلط استعمال بھی ''لہوالحدیث'' کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ وہ بے کار مشاغل ہیں جن میں آج ہماری نوجوان نسل کو مشغول کر کے اسے یادِ الٰہی اور فکر آخرت سے غافل کر دیا گیا ہے۔

❁ ❁ ❁

حرمتِ ناموسِ رسالتؐ

انجینئر نوید احمد

☆ قانونِ توہین رسالت کو ختم کرنے کا ناپاک منصوبہ

جناب انور غازی صاحب نے مورخہ ۵/اکتوبر کو روزنامہ جنگ میں اپنے کالم میں خبردار کیا کہ :

’’کہانی کا آغاز نینسی جے پال (Nancy J Powell) سے ہوتا ہے۔ یہ ۱۶/اگست ۲۰۰۲ء سے ۵/نومبر ۲۰۰۴ء تک پاکستان میں امریکا کی سفیر رہی ہیں۔ پاکستان میں ان کو تعینات کرتے وقت خصوصی طور پر تین ٹاسک دیے گئے تھے۔ایک پاکستان کے نصابِ تعلیم میں تبدیلی‘ دوسرا ۱۹۷۹ء کے حدود آرڈیننس کا خاتمہ یا ترمیم‘ تیسرا توہین رسالت قانون کو ختم کرنا یا ریویو کرنا‘‘۔

’’۲۰۰۳ء سے پاکستان کے نصابِ تعلیم میں تبدیلیوں کا آغاز ہوا جو ۲۰۰۴ء میں اختتام پذیر ہوا۔ابتدائی طور پر امریکا نے پاکستان کے نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے لیے پاکستان کو تین ارب ۹۰ کروڑ روپے دیے۔ ۵فروری ۲۰۰۵ء کو بش نے فخریہ انداز میں کہا تھا: پاکستان کا نصابِ تعلیم میرے کہنے پر تبدیل کیا گیا۔ نصاب سے سیرت رسولﷺ‘ غزوات‘ جہاد کی آیات‘ شہادت کا فلسفہ‘ صحابہ کرامؓ کے واقعات‘ مسلم فاتحین کے حالات‘ اُمہات المومنینؓ کا تذکرہ اور ایسی ہر بات نکال ڈالی گئی جس سے انسان ایک نظریاتی مسلمان بن سکتا ہے اور اب تو اس ملک میں اسلام‘ قرآن اور مجاہدین کا نام تک لینا ناقابلِ معافی جرم بن چکا ہے‘‘۔

’’نصابِ تعلیم کی تبدیلی کے بعد دوسرا اہم ایجنڈا ۱۹۷۹ء والے حدود آرڈیننس کو بہرصورت تبدیل کروانا تھا تاکہ پاکستان کے اسلامی کلچر کو یہود و نصاریٰ کے مادر پدر آزاد معاشرے میں تبدیل کیا جاسکے۔ حدود آرڈیننس کے خاتمے پر پچیس کروڑ روپے خرچ کیے گئے تاکہ ملک میں فحاشی و عریانی پھیلے۔ اس حوالے سے میڈیا کے ذریعے

بھرپور مہم چلائی گئی' زنا بالجبر اور زنا بالرضا پر کھلے عام بحث مباحثے ہوئے' ٹی وی چینلز پر کھلے عام اس نازک اور شرم وحیا والے مسئلے پر بے ہودہ گفتگو ہوئی جس میں حدود ختم کرنے پر زور دیا گیا۔ دلائل میں عورتوں پر رحم کھا کر کہا گیا کہ صنف نازک کو کوڑے مارنا اور حد جاری کرنا ظلم ہے' حالانکہ اللہ نے بعض جرائم پر جو حد مقرر کی ہے اس میں رتی بھر کمی' زیادتی اور ترمیم نہیں ہوسکتی۔ بہرحال نام نہاد حقوقِ نسواں بل پر ۲۰۰۵ء میں کام شروع ہوا اور ۲۰۰۶ء میں حدود آرڈیننس ختم ہوکر ہی رہا۔ اس کے نتیجے میں اب فحاشی وعریانی کا دور دورہ ہے' نکاح مشکل اور زنا آسان ہو چکا ہے''۔

''اس کے بعد توہین رسالت قانون اور امتناعِ قادیانیت آرڈیننس کا نمبر تھا۔ یہ کام ۲۰۰۷ء میں شروع ہونا تھا اور ۲۰۰۸ء تک ختم ہونا تھا۔ لیکن مارچ ۲۰۰۷ء سے مشرف حکومت کی الٹی گنتی شروع ہوگئی اور یہ قانون بچ گیا۔ امریکا اب ہماری موجودہ حکومت سے یہ کام جو انتہائی مشکل ہے' کروانا چاہتا ہے اور حکومت اس کی ہامی بھر چکی ہے۔ ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۲ء تک تین سالوں میں یہ تیسرا اہم ترین (ٹاسک) قانونِ توہین رسالت کو ختم کروانا یا غیر مؤثر کروانا ہے۔ اس کا آغاز گوجرہ' سمبڑیال اور ڈسکہ سانحات' دیوبندی بریلوی اختلافات کو ہوا دے کر اور بعض لیڈروں کے بیانات سے ہو چکا ہے۔ صدر زرداری لندن میں اس کی یقین دہانی کروا چکے ہیں۔ جس طرح مانچسٹر سے قادیانیوں کے رہنما کہتے ہیں کہ اگر پاکستان میں ہمارے خلاف منظور کیا گیا قانون ختم نہ کیا گیا تو پھر یہ ملک اسی طرح جلتا رہے گا' اگر پاکستان سلامتی چاہتا ہے تو پھر یہ قانون ختم ہونا چاہیے۔ پاکستان میں مرزائیوں کی ترجمانی کئی لوگ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ توہینِ رسالت کا قانون ختم ہونا چاہیے''۔

☆ ناموسِ رسالت کا تحفظ ایمان کا لازمی تقاضا

ایک مسلمان نبی اکرمﷺ کی توہین کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ اِس مسئلہ پر جان کی بازی لگانا ایک بہت بڑی سعادت سمجھتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرمﷺ سے محبت ایک مسلمان کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں اس حوالے سے واضح رہنمائی موجود ہے۔

☆ قرآنِ مجید میں ناموسِ رسالت کا ذکر

قرآنِ حکیم کے مطابق مسلمانوں کو کافروں سے جدا کرنے والی حقیقت آپﷺ پر

ایمان ہے:

﴿اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ۝۱ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَاَصۡلَحَ بَالَہُمۡ ۝۲﴾ (محمد)

''وہ لوگ کہ جنہوں نے کفر کیا اور جنہوں نے روکا اللہ کی راہ سے' برباد ہو گئے ان کے اعمال۔ اور وہ لوگ جو کہ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال کیے اور ایمان لائے اُس پر جو کچھ کہ نازل کیا گیا تھا محمدﷺ پر اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے' تو دُور کر دی گئیں ان سے ان کی برائیاں اور سنوار دیا گیا ان کا حال''۔

نبی مکرمﷺ پر ایمان نہ لانے والے پکے کافر ہیں :

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّیُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ۝۱۵۰ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابًا مُّہِیۡنًا ۝۱۵۱﴾ (النساء)

''جو لوگ اللہ سے اور اُس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے بیچ میں ایک راہ نکالنی چاہتے ہیں۔ وہ بلا شبہ پکے کافر ہیں' اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

مؤمن اپنی جانوں سے بڑھ کر آپﷺ سے محبت کرتے ہیں :

﴿اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ﴾ (الاحزاب : ٦)

''نبیﷺ مؤمنوں کے لیے اپنی جانوں سے بڑھ کر عزیز ہیں''۔

﴿مَا کَانَ لِاَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ وَمَنۡ حَوۡلَہُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ یَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰہِ وَلَا یَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِہِمۡ عَنۡ نَّفۡسِہٖ﴾ (التوبۃ : ١٢٠)

''اہل مدینہ کے لیے یہ جائز نہیں تھا اور نہ ان بدوؤں کے لیے جو اس کے اِرد گرد رہتے تھے کہ وہ اللہ کے رسولؐ سے پیچھے رہ جائیں اور یہ کہ وہ اپنی جانوں کو نبیؐ کی جان پر ترجیح دیں''۔

آپ ﷺ کے ادب واحترام کی اہمیت قرآنِ مجید میں یوں بیان کی گئی :

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَهۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَهُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۳﴾﴾ (الحجرات)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو نبی کی آواز سے اور ان کے سامنے اونچی آواز سے اس طرح سے بات نہ کرو جیسے کہ تم میں سے بعض بعض کے لیے کرتے ہیں، کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تمہیں پتا تک نہ ہو۔ بے شک وہ لوگ جو کہ اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں اللہ کے رسول کے سامنے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کا امتحان اللہ لے چکا ہے تقویٰ کے لیے۔ ان کے لیے بخشش بھی ہے اور شاندار بدلہ بھی''۔

اللہ کی اطاعت کا ذریعہ آپ ﷺ کی اطاعت ہے :

﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء : ۸۰)

''جس کسی نے رسول ﷺ کی اطاعت کی پس اُس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

اللہ سے محبت کا بھی عملی اظہار یہ ہوگا کہ محبت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے مبارک اُسوہ کی پیروی کی جائے :

﴿قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰهُ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۱﴾﴾ (آلِ عمران)

''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو (محبت کے ساتھ) میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

رسول اللہ ﷺ سے محبت نہ کرنے والوں کے بارے میں وعید سورۃ التوبۃ، آیت ۲۴ میں دوٹوک انداز میں بیان کی گئی :

﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ

اَحَبَّ اِلَـیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَجِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾

''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں خسارے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں' اگر تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اُس کے رسول ﷺ سے اور اُس کی راہ میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ اپنا فیصلہ (یعنی تمہاری موت)' اور اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

☆ احادیثِ مبارکہ میں ناموسِ رسالت کا ذکر

(۱) عَنۡ اَنَسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ : ((لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی اَکُوۡنَ اَحَبَّ اِلَیۡہِ مِنۡ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ))(۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسُول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اُسے محبوب نہ ہو جاؤں اُس کے والد سے' اُس کی اولاد سے اور یہاں تک کہ تمام انسانوں سے''۔

(۲) قَالَ اَنَسُ بۡنُ مَالِکٍ قَالَ لِی رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ((یَا بُنَیَّ اِنۡ قَدَرۡتَ اَنۡ تُصۡبِحَ وَتُمۡسِیَ لَیۡسَ فِی قَلۡبِکَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافۡعَلۡ)) ثُمَّ قَالَ لِی: ((یَا بُنَیَّ وَذٰلِکَ مِنۡ سُنَّتِی' وَمَنۡ اَحۡیَا سُنَّتِی فَقَدۡ اَحَبَّنِی وَمَنۡ اَحَبَّنِی کَانَ مَعِی فِی الۡجَنَّۃِ)) (۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اے فرزند! اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ صبح یا شام کسی وقت بھی تمہارے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہ رہے تو کر گزرو۔ پھر مجھ سے فرمایا: اے فرزند! یہی میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقے کو پسند کرتا ہے وہ ضرور میری محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا''۔

(۳) عَنۡ عَائِشَۃَ قَالَتۡ : جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ' وَاللّٰہِ اِنَّکَ لَاَحَبُّ اِلَیَّ مِنۡ نَفۡسِیۡ' وَاِنَّکَ لَاَحَبُّ اِلَیَّ مِنۡ اَہۡلِیۡ' وَاَحَبُّ اِلَیَّ مِنۡ وَّلَدِیۡ' وَاِنِّیۡ لَاَکُوۡنُ فِی الۡبَیۡتِ فَاَذۡکُرُکَ فَمَا اَصۡبَرُ حَتّٰی آتِیَکَ فَاَنۡظُرُ اِلَیۡکَ' وَاِذَا ذَکَرۡتُ مَوۡتِیۡ وَمَوۡتَکَ عَرَفۡتُ اَنَّکَ اِذَا دَخَلۡتَ الۡجَنَّۃَ رُفِعۡتَ مَعَ النَّبِیِّیۡنَ' وَاِنِّیۡ اِذَا دَخَلۡتُ الۡجَنَّۃَ خَشِیۡتُ اَنۡ لَّا اَرَاکَ . فَلَمۡ یُرِدۡ عَلَیۡہِ النَّبِیُّ ﷺ حَتّٰی نَزَلَ

جِبۡرِیۡلُ بِھٰذِہِ الۡاٰیَۃِ: ﴿وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا﴾(۳)

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ کی قسم مجھے آپ اپنی جان سے اور اپنے گھر والوں سے' اور اپنے بیٹے سے زیادہ محبوب ہیں۔ جب میں گھر پر ہوتا ہوں تو آپ کی یاد میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپؐ کے پاس آ کر آپؐ کا دیدار کر کے سکون پاتا ہوں۔ البتہ جب میں اپنی اور آپؐ کی موت کو یاد کرتا ہوں تو حسرت کرتا ہوں کہ آپؐ جنت میں داخل ہوں گے تو انبیاءؑ کے ساتھ بلند مقام پر اٹھا لیے جائیں گے اور اگر میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تو ڈرتا ہوں کہ آپؐ کا دیدار نہ کر سکوں گا۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا' یہاں تک کہ حضرت جبریلؑ اِس آیت کے ساتھ نازل ہوئے کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا تو ایسے اشخاص اُن حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا' یعنی انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین' اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں''۔

(٤) **عَنۡ اَنَسِ بۡنِ مَالِکٍ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِیَّ ﷺ مَتَی السَّاعَۃُ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((مَا اَعۡدَدۡتَّ لَھَا:)) قَالَ: مَا اَعۡدَدۡتُّ لَھَا مِنۡ کَثِیۡرِ صَلَاۃٍ وَّلَا صَوۡمٍ وَّلَا صَدَقَۃٍ وَّلٰکِنِّیۡ اُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَـہٗ. قَالَ: ((اَنۡتَ مَعَ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ))(٤)**

حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا' قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِس کے لیے تو نے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ اُس نے عرض کیا: کچھ نہیں' نہ بہت سی نمازیں ہیں' نہ روزے ہیں' نہ صدقے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر (قیامت میں) تو اُنہی کے ساتھ ہوگا جن سے تجھے محبت ہے۔''

(٥) **عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغۡذُوۡکُمۡ مِنۡ نِعَمِہٖ' وَاَحِبُّوۡنِیۡ بِحُبِّ اللّٰہِ' وَاَحِبُّوا اَھۡلَ بَیۡتِیۡ بِحُبِّیۡ)) (٥)**

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ سے محبت رکھو اِس لیے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور مجھ سے محبت رکھو اللہ کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہل بیت سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے۔''

(٦) **عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَحِبُّوا الۡعَرَبَ لِثَلَاثٍ: لِاَنِّیۡ عَرَبِیٌّ وَالۡقُرۡاٰنُ عَرَبِیٌّ وَکَلَامُ اَھۡلِ الۡجَنَّۃِ عَرَبِیٌّ)) (٦)**

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت رکھو: اِس لیے کہ میں عربی ہوں‘ قرآن عربی میں ہے اور اہلِ جنت کی گفتگو بھی عربی زبان میں ہوگی۔‘‘

(۷) **عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَا سَلْمَانُ لَا تَبْغَضْنِيْ فَتُفَارِقَ دِيْنَكَ)) قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ اَبْغَضُكَ وَبِكَ هَدَانَا اللّٰهُ؟ قَالَ: ((تَبْغَضُ الْعَرَبَ فَتَبْغَضُنِيْ))** (۷)

حضرت سلمان ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ’’دیکھو! مجھ سے بغض نہ رکھنا ورنہ دین سے بالکل الگ ہو جاؤ گے۔‘‘ میں نے عرض کی: یا رسُول اللہ! بھلا میں آپؐ سے کیسے بغض رکھ سکتا ہوں‘ آپؐ ہی کے طفیل تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت نصیب فرمائی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے لگو گے۔‘‘

(۸) **عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَاِذَا اَصْحَابُهٗ كَاَنَّمَا عَلٰى رُءُوْسِهِمُ الطَّيْرُ** (۸)

حضرت اسامہ بن شریک ؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کے صحابہ ؓ آپ ﷺ کے اردگرد (ادباً) اِس طرح بے حس و حرکت خاموش بیٹھے ہیں گویا اُن کے سروں پر کوئی پرندہ (بیٹھا) ہے۔

(۹) **عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَةِ جَلَسَ ثَابِتُ بْنُ قَيْسٍ فِيْ بَيْتِهٖ وَقَالَ اَنَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاحْتَبَسَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَسَاَلَ النَّبِيُّ ﷺ سَعْدَ بْنَ مُعَاذٍ‘ فَقَالَ: ((يَا اَبَا عَمْرٍو مَا شَاْنُ ثَابِتٍ اشْتَكٰى؟)) قَالَ سَعْدٌ: اِنَّهٗ لَجَارِيْ وَمَا عَلِمْتُ لَهٗ بِشَكْوٰى‘ قَالَ: فَاَتَاهُ سَعْدٌ فَذَكَرَ لَهٗ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ ثَابِتٌ: اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّيْ مِنْ اَرْفَعِكُمْ صَوْتًا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَنَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ‘ فَذَكَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((بَلْ هُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ))** (۹)

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو! اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز پر بلند مت کرو (الخ) تو حضرت ثابت بن قیس ؓ نے اپنے آپ کو اپنے گھر میں محصور کر لیا اور کہنے لگے کہ میں تو آگ والوں میں سے ہوں اور آپ ﷺ کی خدمت میں آنا

جانا بند کر دیا۔ آپﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ سے دریافت فرمایا: کہو ثابت کیسے ہیں؟ کیا بیمار ہیں؟ حضرت سعدؓ نے عرض کیا وہ میرے پڑوسی ہیں اور مجھے اُن کی بیماری کا علم نہیں۔ اِس کے بعد وہ حضرت ثابتؓ کے پاس آئے اور آنحضرتﷺ کے دریافت کرنے کا حال اُن پر بیان کیا۔ حضرت ثابتؓ بولے کہ یہ آیت (اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت) نازل ہو چکی ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرتﷺ کے دربار میں تم سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے' لہٰذا میں تو اہل جہنم میں سے ٹھہرا۔ حضرت سعدؓ نے آ کر یہ بات آنحضرتﷺ سے ذکر کی۔ آپﷺ نے فرمایا: ''نہیں' بلکہ وہ اہل جنت میں سے ہے۔''

☆ مومنوں کا ناموسِ رسالت کے حوالے سے طرزِ عمل

۞ کعب بن اشرف یہودیوں کا ایک سردار تھا جسے اسلام اور اہلِ اسلام سے نہایت سخت عداوت اور جلن تھی۔ یہ نبیﷺ کو اذیتیں پہنچایا کرتا تھا اور آپﷺ کے خلاف جنگ کی کھلم کھلا دعوت دیتا پھرتا تھا۔ جب جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوگئی تو اللہ کا یہ دشمن' رسول اللہﷺ اور مسلمانوں کی دشمنی میں انتہا پر پہنچ گیا۔ نبی اکرمﷺ کی توہین میں اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی غیرت بھڑکانے کے لیے اشعار کہا کرتا تھا۔ مکہ جا کر قریش کی بدر میں شکست کے حوالے سے آتشِ انتقام کو اور بھڑکاتا رہا۔ اِن حالات میں رسول اللہﷺ نے فرمایا: کون ہے جو کعب بن اشرف سے نمٹے؟ کیوں کہ اُس نے اللہ کو ناراض کیا ہے اور اُس کے رسولﷺ کو اذیت دی ہے۔ اِس کے جواب میں محمد بن مسلمہ' عباد بن بشر' سلکان بن سلامہ' حارث بن اوس اور ابوعبس بن جبر رضی اللہ عنہم نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اِس مختصر سی جماعت نے جس کے کمانڈر محمد بن مسلمہؓ تھے' کعب بن اشرف کو جہنم واصل کیا۔

۞ ۱۹۲۴ء میں ایک ہندو راج پال نے ایک انتہائی توہین آمیز کتاب لکھی' جس میں نبی کریمﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر بڑے اشتعال انگیز اسلوب میں حملے کیے۔ اِس کے جواب میں ایک طرف مولانا ثناء امرتسریؒ نے ''مقدس رسولﷺ'' لکھ کر مسلمانوں کو قلبی سکون پہنچایا اور دوسری طرف ایک محبّ رسولﷺ غازی علم دین نے راج پال کو جہنم واصل کیا اور پھر خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر کے پھانسی کی سزا قبول کی اور شہید کا لقب پایا۔

۞ ۱۹۳۳ء میں ایک ہندو نتھو رام نے ''ہسٹری آف اسلام'' کے نام سے ایک کتاب میں نبی کریمﷺ کی شانِ اقدس میں سخت گستاخی کی۔ مسلمانوں نے اُس کے خلاف کراچی کی عدالت

میں مقدمہ دائر کر دیا۔ ۱۹۳۴ء میں ایک نوجوان عبدالقیوم نے عدالت میں مقدمے کی سماعت کے دوران نتھو رام پر چاقو سے بھرپور وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔ انگریز جج نے ڈائس سے اُتر کر اُس سے پوچھا: ''تم نے اِس شخص کو کیوں قتل کیا؟ غازی عبدالقیوم نے عدالت میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ تصویر تمہارے بادشاہ کی ہے' کیا تم اپنے بادشاہ کی توہین کرنے والے کو موت کے گھاٹ نہیں اتارو گے؟ اِس ہندو نے میرے آقا کی شان میں گستاخی کی جسے میری غیرت برداشت نہ کر سکی''۔

۞ سلمان رشدی ملعون نے توہین رسالت پر مبنی کتاب The Satanic Verses لکھی۔ اِس کے خلاف علماء کرام نے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا اور وہ خفیہ پناہ گاہوں میں روپوش ہونے پر مجبور ہے۔

۞ تسلیمہ نسرین ملعون نے بنگلہ دیش میں توہین آمیز مضامین لکھے۔ اِس کے خلاف بھی قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ وہاں کی حکومت نے اُسے رازداری سے بیرونِ ملک فرار کرا دیا اور اب وہ بھی خفیہ پناہ گاہ میں محصور رہنے پر مجبور ہے۔

☆ خدشات

توہین رسالت کا قانون جو تمام مسالک کے نزدیک یکساں محترم و مقدس ہے' کو یک بیک ختم کرنا شاید حکومت کے لیے اتنا آسان نہ ہو مگر بازی گروں کے پاس حیلوں کی کمی نہیں۔ ایک حیلہ جس کا بہت زیادہ امکان ہے وہ نظر ثانی (Review) کے نام پر قانون کو غیر معینہ مدت کے لیے سرد خانے میں ڈالنے کا خوفناک طریقہ ہے۔ درباری بڑے احترام سے کہیں گے کہ ہم ناموسِ رسالت کے قانون کو بدلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے' فقط اِس کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے قانون پر از سر نو نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ پھر نظر ثانی کے نام پر اس قانون کو التوا میں ڈال دیا جائے گا اور اس وقت تک عدالتیں اس قانون کے مطابق سزائیں نہ دے سکیں گی۔ یہ اسی گہری مکروہ سازش کے تانے بانے ہیں جس کی منادی نیو یارک سے ہوئی ہے اور دیسی غلام' فرنگی آقاؤں کے فرمان پر دل و جان سے عمل کرنے کے لیے مچل رہے ہیں۔ توہینِ رسالت کا قانون ناموسِ رسالت کے پاسداروں کے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہے اور اِس پر مسلکی اختلافات سے بالاتر ہو کر ردعمل سامنے آئے گا۔ لیکن موجودہ حکومت جس کی پشت پر امریکا و برطانیہ جیسی طاقتیں کھڑی ہیں' کے پاس عوام کو نان ایشوز میں الجھانے کے

بیسیوں طریقے ہیں۔ ہماری حکومت سادہ لوح عوام کو ان ایشوز میں الجھا کر اندر ہی اندر کام کرتی رہے گی۔ جب پانی سر سے گزر جائے گا تو عوام اور علماء بیدار ہوں گے، احتجاج ہوگا، جلسے جلوس ہوں گے اور پھر آہستہ آہستہ حالات معمول پر آجائیں گے۔ نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے وقت اور حدود آرڈیننس کے خاتمے کے وقت بھی یہی ہوا تھا۔

☆ لائحۂ عمل

اگر پاکستان کے مسلمان چاہتے ہیں کہ توہین رسالت کا قانون اور امتناعِ قادیانیت آرڈیننس موجود رہے تو پھر ابھی سے تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام اور عوام جو عاشقانِ رسول ہیں، کو باہم مل کر حکمرانوں اور امریکی ایجنٹوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانا چاہیے اور اس کے لیے :

(i) اپنے ذاتی کردار کو نبی اکرمﷺ کی شریعت کے مطابق استوار کریں تاکہ مختلف فتنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شامل حال ہو، بقول الطاف حسین حالی :

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ بائبل میں مذکور ہے کہ اُنہوں دیکھا کہ کچھ لوگ بڑے غیظ وغضب کے ساتھ ایک شادی شدہ عورت کو زنا کا جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سنگسار کرنے لے جارہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اُن کے ساتھ شامل ہوگئے۔ عورت کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا اور اب پتھر مارنے کا آغاز ہونے والا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے آواز لگائی ''ٹھہر جاؤ! پہلا پتھر وہ مارے جس نے خود کبھی زنا نہ کیا ہو''۔ مجمع پر سکوت طاری ہوگیا اور رفتہ رفتہ لوگ وہاں سے منتشر ہوگئے۔ اِسی طرح ہم بھی توہین رسالت کے حوالے سے مظاہروں میں تو بڑے پُرجوش ہیں لیکن اپنا جائزہ لیں کہ کہیں شریعتِ محمدیﷺ کی تعلیمات سے پہلوتہی کر کے ہم خود بھی توہین رسالت کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟ بلاشبہ نبی اکرمﷺ کی محبت ہمارے ایمان کا لازمی جزو ہے لیکن ایمان ہی کے حوالے سے آپﷺ کا یہ ارشاد بھی تو ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))(۱)

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہشِ نفس اُس ہدایت کے تابع نہ ہوجائے جو میں لایا ہوں۔''

(ii) حکومت امریکہ کی غلامی میں آخری انتہا تک پہنچ چکی ہے۔ اگر اِس موقع پر غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تو جسارتیں اور بڑھیں گی۔ لہٰذا تحریر‘ تقریر اور ریلیوں کے ذریعہ پُرامن اور منظّم احتجاج کیا جائے۔ ہڑتالوں‘ توڑ پھوڑ اور آتش زنی سے ہم اپنا نقصان کریں گے۔ ہڑتالیں‘ توڑ پھوڑ اور آتش زنی‘ احتجاج کی وہ صورتیں ہیں جو تقویٰ کے خلاف ہیں۔

(iii) ایک ایسی اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے جو واقعی اسلامی شعائر کی حفاظت کر سکے۔ بلاشبہ مظاہرے اِس دور میں احتجاج ریکارڈ کرانے کی ایک صورت ہے لیکن اصل کام یہ ہے کہ صحابہ کرام ؓ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایسی اسلامی ریاست قائم کی جائے جو جرأت کے ساتھ فتنوں کو چیلنج کر کے اُن کا سدباب کر سکے۔ دشمنوں کو اصل نفرت اسلام سے ہے اور اُن کی سازشوں کا منہ توڑ جواب یہ ہے کہ ہم اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم کر کے اُن کے عزائم کو خاک میں ملا دیں۔ سوائے ایران کے تمام مسلم ممالک میں مغرب کے ایجنٹ حکمران ہیں‘ اِن کی وجہ سے مغرب کو اپنے مفادات خطرے میں نظر نہیں آ رہے۔ اِن حکمرانوں کی وجہ سے اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC) کا کردار نہایت غیر مؤثر بلکہ مجرمانہ ہے۔ عوام احتجاج کر کے چند روز میں خاموش ہو جائیں گے‘ راوی چین لکھے گا اور عالم کفر ہماری بے بسی پر خندہ زن ہوگا۔ اگر ہم ذاتی زندگی میں شریعتِ محمدی ﷺ پر عمل نہیں کرتے اور شریعتِ محمدی ﷺ پر مبنی نظام کے نفاذ کی کوشش نہیں کرتے تو پھر ہماری مظاہروں میں شرکت نفس کا دھوکہ اور شیطان کی پڑھائی ہوئی پٹی ہے تاکہ اِس کے ذریعے وہ ہمیں باوجود بداعمالیوں کے مطمئن کر دے کہ ہم نے محبتِ رسول ﷺ کا حق ادا کر دیا۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب حب الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب وجوب محبة رسول اللّٰہ اکثر من الاھل والولد والوالد۔

(۲) سنن الترمذی‘ ابواب العلم‘ باب ما جاءِ فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔

(۳) مجمع الزوائد للھیثمی ۱۰/۷۔ وسلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی ۱۰٤٤/٦۔

(٤) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب علامة حب الله عزوجل۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب المرء مع من احب۔

(٥) سنن الترمذی‘ ابواب المناقب‘ باب مناقب اھل بیت النبی ﷺ۔

(٦) مستدرك حاکم و سنن البیھقی۔

(۷) سنن الترمذی، ابواب المناقب، باب فی فضل العرب۔ ومسند احمد، ح:۲۲٦۱۵، باقی مسند الانصار۔

(۸) مسند احمد، ح۱۷۷۲۵۔ اول مسند الکوفیین۔

(۹) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب مخافة المؤمن ان یحبط عمله۔

(۱۰) مشکوة المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنة۔

اصحابِ رسولؐ کی استقامت کی چند روشن مثالیں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ پاک باز ہستیاں تھیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آپؐ کے ساتھ محبت اور فرمانبرداری کا حق ادا کر دیا۔ جہاں مال کی ضرورت ہوئی مال خرچ کیا اور اگر جان دینے کا موقع آیا تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔صحابہؓ انسان تھے‘ان سے خطائیں اور تقصیریں بھی ہوئیں‘ مگر اُن کی تمام تر جدوجہد اسلام کی سربلندی کے لیے تھی۔ وہ اپنے افعال میں نیک نیت تھے۔یہی وجہ ہے کہ ربِّ کائنات نے کتابِ ہدایت میں اُن پاک باز ہستیوں سے راضی ہونے کا اعلان کر دیا رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین مخاطب یہی لوگ تھے‘ جو عام انسان تھے اور اس بگڑے ہوئے معاشرے کے افراد تھے‘ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے اُن کے اندر وہ تبدیلی آئی کہ جس معاشرے میں وہ رہ رہے تھے اس کے طور طریقوں سے انہیں شدید نفرت ہوگئی اور انہوں نے دل و جان سے اسلام کو پسند کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دے کر آپؐ کے ہر حکم کو بطیّب خاطر قبول کر لیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا‘ کیونکہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتے ہوئے انقلاب کی آواز لگانا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہ اذیتیں برداشت کرنا پڑیں کہ جن کے ذکر سے انسان کانپ اٹھتا ہے مگر وہ ان تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے اور اپنی حقیقی کامیابی جانتے ہوئے

فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ کا نعرہ لگاتے رہے۔

اسلام کی دعوت پر آغاز ہی میں لبیک کہنے والے اکثر و بیشتر معاشرے کے پسماندہ لوگ اور غلام تھے‘ جو عام طور پر دولت مند سرداروں کے زیر بار احسان تھے‘ مگر ان لوگوں نے حق کی حمایت میں اپنے مالی نقصان کو پرکاہ کے برابر حیثیت نہ دی۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی شخص نے اسلام قبول کیا تو قرض خواہ ساہوکار نے اسے قرضہ معاف کرنے کا لالچ دے کر اسلام چھوڑ دینے کی ترغیب دی‘ مگر اس نے صاف انکار کر دیا‘ بلکہ اسے اپنے ایمان کا امتحان سمجھ کر اسلام کے لیے زیادہ پختہ ہو گئے۔ عاص بن وائل کے ذمہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی اُجرت تھی‘ جب انہوں نے تقاضا کیا تو کہنے لگا کہ جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار نہ کرو گے تمہاری رقم نہیں دوں گا۔ اس پر حضرت خبابؓ نے کہا کہ ایسا تو ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اگر تم مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ تو بھی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہیں کروں گا۔ (صحیح بخاری) ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شخص ایمان لاتے ہی اپنے مورث کی جائیداد سے محروم ہو جاتا۔ جیسا کہ ہجرت کر کے جانے والے تقریباً سب اصحابِ رسول کو یہ نقصان اٹھانا پڑا مگر کسی کے پاؤں میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ الغرض کسی طرح کا لالچ اصحابِ رسولؐ کو حق سے برگشتہ نہ کر سکا۔ عیسائی شاہِ حبشہ نے جب اپنے دربار میں جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا تو حضرت جعفرؓ نے شاہی دربار کے رعب کو کچھ بھی اہمیت نہ دی اور نہ اس بات کو خاطر میں لائے کہ نصرانی بادشاہ ناراض ہو جائے گا‘ بلکہ بھرے مجمع میں حق کا اعلان اس طرح کیا جس طرح قرآن مجید میں تھا۔ یعنی ”عیسیٰ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں‘ اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں“۔ یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا عیسیٰ بن مریم اس کے سوا ایک تنکے سے بھی زیادہ نہیں۔ (مسند احمد بن حنبل)

اسلام کی خاطر سختیاں برداشت کرنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی استقامت کی مثال نہیں ملتی۔ وہ غلام تھے۔ اُن کا آقا اُمیہ بن خلف انہیں لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیتا۔ لڑکے انہیں مکہ کی سنگلاخ پہاڑیوں پر گھسیٹتے پھرتے مگر ان کی قوتِ ایمانی میں ذرہ برابر کمزوری نہ آئی بلکہ وہ مسلسل اَحداَحد پکارتے رہے۔

حضرت عمار اور یاسر رضی اللہ عنہما بھی حد درجہ ستائے گئے۔ ایک دفعہ حضرت یاسر‘ حضرت عمار اور اُمّ عمار حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم کو اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے فرمایا: ”آلِ یاسر صبر کرو‘ اے آلِ یاسر صبر کرو‘ کیونکہ تم سے وعدہ کیا گیا

ہے کہ تمہیں جنت ملے گی''۔ ابوجہل نے برچھی مار کر حضرت سمیہ ؓ کو شہید کر دیا۔ (اُسد الغابہ) اسلام میں سب سے پہلے شرفِ شہادت اس خاتون کو نصیب ہوا۔

حضرت خباب بن ارت ؓ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو اُن پر حد درجہ سختی کی گئی تا کہ وہ اسلام چھوڑ دیں۔ حضرت خبابؓ اُمّ انمار کے غلام تھے۔ مشرکوں نے حضرت خبابؓ کے لیے کوئلے دہکائے اور انہیں ننگی پیٹھ ان کے اوپر لٹا دیا۔ حضرت خبابؓ کی چربی نے اس آگ کو بجھایا۔ (اسد الغابہ) مگر یہ سختی حضرت خبابؓ کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا کرسکی۔

حضرت مصعب بن عمیر ؓ مکہ کے خوبصورت ترین نوجوان تھے' انتہائی خوش لباس تھے' خوشحال ماں باپ کے بیٹے تھے۔ اس نوجوان پر اللہ مہربان ہوا' اس نے اسلام قبول کیا مگر اپنے والدین اور قوم کے خوف سے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کرتا رہا۔ ایک دن کسی نے اُن کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تو جا کر ان کی والدہ اور قوم کے افراد کو بتا دیا۔ اس پر انہیں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ یہ وہاں سے نکل کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ جب دوسرے مسلمانوں کے ساتھ واپس مکہ آئے تو ان کی خستہ حالت قابل رحم تھی۔ ناز و نعم میں پرورده یہ نوجوان اپنا حسن و جمال اور خوش پوشی اسلام پر قربان کر چکا تھا۔ یہ وہی مصعب بن عمیرؓ ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ہجرت سے پہلے مبلغ بنا کر مدینہ میں بھیجا تھا۔ جہاں اُن کی تبلیغ سے بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ (ابن سعد)

حضرت عثمان بن مظعون ؓ ولید بن مغیرہ کی پناہ میں تھے۔ اسلام قبول کر چکے تھے مگر آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ تو تکلیفیں اٹھائیں اور میں آرام میں رہوں' ایسا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ کی پناہ سے نکل گئے۔ اب ان پر بھی سختیاں شروع ہوئیں۔ حق گوئی کی پاداش میں ایک کافر نے غصے میں آ کر اُن کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ سیاہ ہوگئی۔ اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا میرے بھتیجے! اگر تم میری پناہ میں رہتے تو تمہیں ہرگز تکلیف نہ پہنچتی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اللہ کی قسم میرا دل چاہ رہا ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر میری تندرست آنکھ کو بھی وہی تکلیف پہنچے جو دوسری کو پہنچی ہے۔ میں اُس ذات کی پناہ میں ہوں جو بہت عزت والے اور بڑی قدر والے ہیں۔ ولید نے حضرت عثمانؓ سے کہا دوبارہ میری پناہ میں آ جاؤ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ (البدایہ)

حضرت ابوفکیہ ؓ کو اسلام لانے پر مشرکین دھوپ میں لٹا دیتے' پھر پشت پر پتھر رکھ

دیتے۔ یہاں تک کہ اُن کے حواس جاتے رہتے۔ ایک دن اُمیہ نے اُن کے پاؤں میں رسی باندھی اور لوگ انہیں گھسیٹنے لگے۔ پھر انہیں تپتی ہوئی زمین پر لٹا دیا۔ اسی دوران راہ میں ایک گبریلا جا رہا تھا۔ اُمیہ نے حقارت کے ساتھ کہا ''ابوفکیہ تیرا پروردگار یہی تو نہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''میرا اور تیرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے''۔ اس پر اُس نے زور سے آپ کا گلا دبایا۔ ابوفکیہ کا سنگ دل بھائی جو پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا اس کو اور اذیت دو (اسد الغابہ) ان ساری سختیوں کے باوجود ابوفکیہ رضی اللہ عنہ کے پائے استقلال میں ذرا بھر لغزش نہ آئی۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ دیتے اور آگ کا دھواں ان کی ناک میں سے گزارتے اور کہتے کفر کی طرف واپس لوٹ آؤ۔ حضرت زبیرؓ کہتے اب کبھی کافر نہ بنوں گا (طبرانی)۔ ایک شخص نے آپ کے جسم پر زخموں کے نشان دیکھے تو کہنے لگا میں نے اتنے زخم کسی اور کے جسم پر نہیں دیکھے۔ حضرت زبیرؓ نے کہا اللہ کی قسم ان میں سے ہر زخم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اللہ کی خاطر لگا ہے۔ (طبرانی)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کے چچا حکم بن ابوالعاص بن امیہ نے انہیں رسّی میں باندھ دیا اور کہا تم نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے' جب تک تم اس دین کو نہ چھوڑو گے میں تمہیں نہیں کھولوں گا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں اس دین کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب حَکَم اُن کی استقامت کے سامنے بے بس ہو گیا اور محسوس کر لیا کہ عثمان اپنے دین کو نہیں چھوڑے گا تو ان کی رسّی کھول دی۔ (ابن سعد)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مَردوں میں سب سے پہلے اسلام لے آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو بن گئے۔ ہمہ وقت آپؐ کی صحبت میں رہتے اور اسلام کی تبلیغ میں لگ گئے۔ آپؓ کی دعوت پر کئی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جب مرد صحابہ کی تعداد اڑتیس تک پہنچ گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اب کھل کر اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے مگر آپؐ نے اجازت نہ دی۔ جب ان کا اصرار زیادہ ہوا تو آپؐ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حرم شریف کے اندر مجمع عام میں اسلام کی دعوت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہاں دوسرے مسلمان بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکر کا بیان سن کر مشرکین آپؓ پر پل پڑے اور آپ کو مارنا شروع کر دیا۔ اتنا مارا کہ آپؓ بے ہوش ہو گئے۔ بنوتیم والے انہیں ان کے گھر لے گئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ اس پر بنوتیم والے بھی آپ کو چھوڑ کر

چلے گئے۔ آپ کی والدہ نے کچھ کھانے کو کہا تو آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کے سخت اصرار پر وہ آپ کو دارِارقم میں رسول اللہﷺ کے پاس لے گئیں۔ ابوبکر کو دیکھ کر رسول اللہﷺ پر رقت طاری ہوگئی‘ ان پر جھک گئے اور ان کا بوسہ لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول میری والدہ کے حق میں دعا فرمائیں کہ وہ حق قبول کر لیں۔ اس پر رسول اللہﷺ نے ابوبکرؓ کی والدہ کو حق کی دعوت دی اور اُن کے حق میں دعا کی۔ چنانچہ ان کی والدہ نے اسلام قبول کر لیا۔

جب حضرت ابوذر غفاریؓ کو رسول اللہﷺ کی بعثت کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنے بھائی کو حالات سے آگاہی کے لیے مکہ بھیجا۔ بھائی مکہ پہنچا‘ رسول اللہﷺ کی باتیں سنیں اور آ کر حضرت ابوذرؓ کو اطلاع دی کہ وہ عمدہ کلام سناتے ہیں اور عمدہ اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوذرؓ خود سامانِ سفر لے کر مکہ کی طرف چل پڑے۔ وہاں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی اور آپ اُن کی معیت میں رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ رسول اللہﷺ کی باتیں سنیں اور اسی جگہ مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہﷺ نے اُن کو اپنے قبیلے میں واپس جانے کو کہا مگر حضرت ابوذرؓ نے کہا قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس کلمۂ توحید کا کافروں کے درمیان کھڑے ہو کر پورے زور سے اعلان کروں گا۔ چنانچہ وہ چل کر مسجد حرام میں آئے اور کلمۂ شہادت بلند کیا۔ یہ سن کر مشرکین اُن پر حملہ آور ہو گئے۔ اُن کو اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گئے۔ حضرت عباسؓ نے آ کر انہیں کافروں سے چھڑایا مگر اگلے دن ابوذر نے پھر ایسا ہی کیا اور کافروں نے پھر انہیں زدوکوب کیا۔ (صحیح بخاری)

مشہور واقعہ ہے کہ عمر بن خطابؓ کو رسول اللہﷺ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے رسول اللہﷺ کے قتل کا ارادہ کیا اور تلوار لے کر چل پڑے۔ راستے میں انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعید بن زیدؓ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اس پر عمر بن خطاب غصے سے لال پیلے ہو کر بہن کے گھر کی طرف چل پڑے۔ بہن اور بہنوئی نے اسلام کا اقرار کیا تو عمر نے سعید بن زید کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ بہن چھڑانے آئی تو اس کا چہرہ بھی زخمی کر دیا۔ بہن کا خون دیکھ کر عمر کا دل پسیجا۔ بہن اور بہنوئی سے گفتگو کی۔ اُن کی استقامت دیکھ کر عمر نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ میاں بیوی پر یہ سختی انہیں اسلام سے برگشتہ نہ کر سکی بلکہ عمرؓ کے اسلام کا باعث بن گئی۔ (صحیح بخاری) اونٹ چرانے والے یہ وہی عمر ہیں جو اسلام لانے کی بدولت امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ بنے اور جن کے بارے میں رسول اللہﷺ نے فرمایا: ”اگر میرے بعد

کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔''

اسلام کی خاطر اصحابِ رسولؐ نے طرح طرح کی تکلیفات برداشت کیں مگر اُن کے پائے استقلال متزلزل نہ ہوئے۔ اپنے عزیز رشتہ داروں' ماں باپ سے کٹ جانا معمولی بات نہیں' کیونکہ یہی لوگ مشکل کی گھڑی میں کام آتے ہیں۔ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کو قطع علائق کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے دنیا کی تمام محبتوں کو اسلام کی خاطر قربان کر دیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اُن کی ماں سخت ناراض ہوئی اور قسم کھائی کہ جب تک وہ اسلام نہ چھوڑیں گے وہ نہ ان سے کلام کرے گی اور نہ کھائے پیے گی۔ ماں نے تین دن بھوک پیاس میں گزارے اور فاقے کی شدت سے بے ہوش ہوگئی مگر حضرت سعدؓ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ اگر تم ہزار بار بھی مروتب بھی میں اس دین کو نہ چھوڑوں گا۔ (اسد الغابہ)

حضرت عیاش بن ابی ربیعہ اور حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہما اسلام لائے تو کفار نے دونوں کے پاؤں کو اکٹھا باندھ دیا مگر اُن کی یہ سختی بے اثر رہی (طبقات ابن سعد)۔ اسی طرح حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو ان کے باپ نے اُن پر سختی شروع کی' کوڑے مارے' قید کیا' کھانے پینے کو کچھ نہ دیا' گھر کے تمام افراد نے اُن کے ساتھ بول چال بند کر دی' مگر اس سختی کا حضرت خالدؓ پر ذرا بھی اثر نہ ہوا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا اور اہل خانہ کی لاتعلقی اور تکالیف کو اسلام کی خاطر بطیّب خاطر گوارا کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن حُذافہ رضی اللہ عنہ گرفتار ہو کر رومی بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے' اُس نے طرح طرح سے آپ کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اُس نے یہ کہا کہ اے عبداللہ میں تمہیں اپنے ملک اور سلطنت میں شریک کر لوں گا اگر تم اسلام چھوڑ دو' مگر حضرت عبداللہؓ نے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ نے قتل کی دھمکی دی جو بے اثر رہی۔ پھر اس نے حضرت عبداللہؓ کو سولی پر لٹکا دیا اور ان کو خوفزدہ کرنے کے لیے اُن پر اس طرح تیروں کی بارش کر دی کہ تیر ان کے جسم کے پاس سے گزریں۔ پھر انہیں عیسائیت قبول کرنے کو کہا' مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر انہیں اُبلتے ہوئے پانی کی دیگ میں ڈالنے کی دھمکی دی اور اُن کے سامنے ایک قیدی کو ابلتے پانی میں ڈال کر ہلاک بھی کر ڈالا۔ اب اُن کے سامنے عیسائیت پیش کی مگر حضرت عبداللہؓ نے صاف صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ عبداللہؓ کی استقامت سے بہت متأثر ہوا

کہ یہ کس قسم کا انسان ہے اور اس کی اسلام کے ساتھ کس درجہ وابستگی ہے کہ وہ اس کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہے بلکہ اپنی جان دینا بھی اس کو عین گوارا ہے۔ اب بادشاہ نے کہا کہ تم میرے سر کا بوسہ لے لو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا صرف مجھے نہیں بلکہ تمام مسلمان قیدیوں کو چھوڑنے کا وعدہ کرو۔ چنانچہ اس نے وعدہ کر لیا۔ حضرت عبداللہؓ نے بادشاہ کے سر کا بوسہ لیا اور تمام مسلمان قیدیوں کو لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور بتا دیا کہ میں ہرگز اس نصرانی بادشاہ کے سر کا بوسہ نہیں لینا چاہتا تھا مگر میں نے تمام مسلمان قیدیوں کی آزادی کی خاطر ایسا کر لیا۔ حضرت عمرؓ حضرت عبداللہؓ کے اس کام سے بہت خوش ہوئے۔ (کنز العمال)

اصحابِ رسولؐ میں عبداللہ نامی چار شخصیات نہایت ممتاز اور صاحبِ عزیمت وفضیلت تھیں، جن کے لیے ''عبادلہ اربعہ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ وہ تھے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔ ان کے یادگار کارنامے، خدمات اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بے مثال محبت اُمت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ ان کے علاوہ اصحابِ رسولؐ میں ایک عبداللہ اور بھی ہیں جنہوں نے اسلام کی خاطر اپنی ہر شے قربان کر دی۔ صرف تن میں جان باقی تھی وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے حضور شہادت کے لیے پیش کر دی۔ قبل از اسلام عبدالعزیٰ نام تھا۔ ابھی شیر خوارگی کے دور میں تھے کہ والد فوت ہو گیا۔ چچا کی سرپرستی میں بچپن اور لڑکپن گزارا۔ جوان ہوئے تو چچا نے ضرورت کی ہر چیز مہیا کر کے انہیں خود کفیل کر دیا۔ ہجرتِ نبویؐ کے بعد جب دُور ونزدیک اسلام کا چرچا ہوا تو اس نوجوان کے مقدر بھی جاگ اٹھے۔ اس نے قبولِ اسلام کا ارادہ کر لیا بلکہ دل ہی دل میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ چچا کا زیر بار احسان تھا۔ انتظار کرتا رہا کہ چچا اسلام لے آئے تو وہ بھی اپنے اسلام کا اعلان کر دے۔ اسی انتظار میں ماہ وسال گزر گئے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا۔ اب اس جوان میں مزید صبر کا یارا نہ رہا۔ اپنے چچا کے پاس جا کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ یہ سن کر چچا آپے سے باہر ہو گیا، ڈرایا دھمکایا، مگر بے اثر۔ آخر چچا نے کہا تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ میں نے دیا ہے، وہ سب کچھ میں تجھ سے چھین لوں گا۔ یہ جوان کہنے لگا یہ دنیاوی چیزیں چند روز تک مجھ سے ویسے ہی چھن جائیں گی، آپ لے لیں گے تو پھر کیا۔ چچا نے اس سے ہر چیز لے لی۔ چچا نے تقاضا کیا تو بدن کے کپڑے، پاؤں کے جوتے اور تہبند بھی اتار کر چچا کے حوالے کر دیا۔ مادر زاد برہنہ ماں کے گھر گئے۔ ماں نے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور پریشان ہو کر پوچھا تو جواب دیا کہ میں مؤمن

وموحد ہو گیا ہوں' مجھے ستر پوشی کے لیے کپڑا دے دیجیے۔ ماں نے ایک کمبل دیا' جوان نے اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک کو تہبند کے طور پر باندھا اور دوسرا چادر کے طور پر اوڑھ کر مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ حالات سنائے۔ نام بتایا تو آپؐ نے فرمایا: نہیں' آج سے تمہارا نام عبداللہ ہے' تم یہیں ہمارے قریب ٹھہرو اور مسجد میں رہا کرو۔ ایک دن اونچی آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ٹوکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: عمر اس کو چھوڑ دو' یہ تو خدا اور رسول کے لیے سب کچھ چھوڑ آیا ہے۔

جنگ تبوک کا موقع آیا جس میں اصحابِ رسول نے اونٹ' گھوڑے اور درہم و دینار پیش کیے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس جسم و جان کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا' حضورؐ میرے حق میں شہادت کی دعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا کسی درخت کا چھلکا اتار کر لے آؤ۔ آپؐ نے وہ چھلکا عبداللہؓ کے بازو پر باندھا اور دعا کی اے اللہ میں عبداللہ کا خون کفار پر حرام کرتا ہوں۔ عبداللہؓ نے اس دعا پر حیرت کا اظہار کیا' کیونکہ وہ تو شہادت کے آرزومند تھے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم راہِ خدا میں نکل پڑے اب اگر بخار سے بھی مر جاؤ تو تم شہید ہو۔ تبوک پہنچے تو عبداللہ کو واقعی بخار آ گیا جس سے وہ فوت ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ان کی قبر بنائی۔ دفن کے بعد دعا کی اے اللہ میں آج شام تک اس مرنے والے سے خوش رہا ہوں' تو بھی اس سے راضی ہو جا۔

(بحوالہ موت انسانیت کے دروازے پر' از ابوالکلام آزاد)

اصحابِ رسولؐ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور تلاش کر کے اسلام حاصل کیا۔ انہوں نے حصولِ اسلام کی راہ میں حد سے زیادہ تکالیف اٹھائیں' وہ دولتِ اسلام کے حقیقی قدردان ہوئے۔ آج ہم لوگوں کو مفت میں اسلام کی دولت مل گئی۔ پیدا ہوتے ہی کان میں توحید و رسالت کی آواز ڈال دی گئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ نعمتِ ایمان پر اللہ کا شکر ادا کریں' خود اسلام کے احکام سیکھیں' اُن پر دل و جان سے عمل کریں اور اپنے دائرۂ اختیار میں اسلام کی باتیں دوسروں تک پہنچائیں۔ اسلام کی جامع تعلیمات کو فروغ دیں اور دین کی سربلندی کے لیے اپنا مال اور صلاحیتیں صرف کریں تاکہ عنداللہ سرخرو ہو سکیں۔ اسلام سب سے بڑی بلکہ حقیقی نعمت ہے' اس کی قدر کرنا ضروری ہے' کیونکہ قدر و قیمت والی چیز کی قدر نہ کرنا جاہلانہ بات ہے جس کا انجام انتہائی خوفناک ہے۔

اسلامی مدارس میں عربی کی تعلیم

خشتِ اوّل درست کرنے کی ضرورت

محمد بشیر ☆

عربی زبان دینِ اسلام کی پہچان اور شعار ہے۔ کیونکہ اس میں ہماری آخری اور ابدی کتاب ''قرآن کریم'' نازل ہوئی' اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی زبان یہی تھی۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ عرب تھے۔ قرآن کریم کی طرح تمام احادیث کا ذخیرہ اور آپؐ کی سیرتِ مبارکہ اسی زبان میں ہے۔ المختصر دین اسلام کی تمام تعلیمات اور ہماری عبادات کے تمام اذکار' دعائیں اور آداب بھی اسی عربی زبان میں ہیں۔

ہر مسلمان عربی سیکھتا ہے

عربی زبان کی اس دینی اور شرعی اہمیت کی وجہ سے ہر باشعور مسلمان اسے سیکھتا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اسے بولتا بھی ہے۔ ہمارے خطے کے مسلمان خاندانوں میں ایک اچھی روایت نسلوں سے چلی آ رہی ہے کہ وہ شعوری عمر کو پہنچتے ہی اپنے ننھے بچوں کی خواندگی کا آغاز قرآن کریم کی تعلیم سے کرتے ہیں' جس کی ابتدا تعلیم قرآن کے ابتدائی اور تمہیدی قاعدوں' بغدادی قاعدہ' یسرنا القرآن یا نورانی قاعدے کی تدریس سے ہوتی ہے۔

بچہ اس تمہیدی قاعدے کو دو یا تین سال مسلسل محنت سے پڑھتا رہتا ہے اور عربی حروف کی مفرد اور مرکب شکلوں نیز ان کی حرکات کی متنوع صورتوں اور استعمالات کی مشق کرتے ہوئے قرآن کریم کے الفاظ' مرکبات' جملوں اور آیات کی قراءت سیکھتا ہے اور وقف و وصل کے اصولوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ یوں مسلمان بچے تین یا چار سال کی عمر کو پہنچتے ہی قرآن کریم کی عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور اسے صحیح پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت حاصل

☆ پرنسپل معهد اللغة العربية ' اسلام آباد

کر لیتے ہیں۔

اس تمہیدی قاعدے کو پڑھنے کے بعد یہ خوش نصیب بچے قراءت کے انہی اصولوں کے مطابق قرآن کریم کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھنے کی مشق اور تربیت لیتے ہیں‘ جسے ناظرہ قرآن کریم کی خواندگی کہا جاتا ہے۔اس میں وہ ایک یا دو سال مسلسل محنت کرتے ہیں۔

اس ناظرہ قرآن کریم کورس کے دوران وہ کئی منتخب سورتوں کو زبانی بھی یاد کرتے ہیں۔ نیز وہ مکمل نماز کے اذکار‘ اذان اور دیگر مواقع پر پڑھے جانے والے اذکار اور دعاؤں کو بھی ازبر کر لیتے ہیں۔اس مدت میں بچے قرآن کریم کی آسان اور سلیس عربی زبان میں جب اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور آیات کو بار بار اور تکرار سے پڑھتے اور دہراتے رہتے ہیں تو ان کے دلوں اور ذہنوں میں قرآنی الفاظ‘ مرکبات‘ محاورے اور جملے بلکہ پوری پوری آیات پختہ اور محفوظ ہو جاتی ہیں۔وہ رفتہ رفتہ تیس پاروں پر مشتمل قرآن کریم کی لغت عربی کے عظیم اور وسیع ذخیرے سے اچھی طرح مانوس اور واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔

اسلامی تعلیم و تربیت کا اچھا آغاز

مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا یہ پہلا کورس جو بغدادی قاعدے اور ناظرہ قرآن کریم پر مشتمل ہے ایک جامع اور مفید کورس ہے‘ کیونکہ اس میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا ایسا عمدہ اور جامع پروگرام دیا گیا ہے جو درج ذیل بنیادی اور ضروری نکات کو شامل ہوتا ہے:

(۱) کتاب اللہ کی قراءت کے ضروری قاعدوں کی تعلیم اور مشق۔

(۲) کتاب اللہ کی صحیح اور پختہ تلاوت کی نظری اور عملی تربیت۔

(۳) اسلام کے پہلے دو بنیادی ارکان شہادتین اور نماز کی تعلیم اور عملی تربیت۔

(۴) بنیادی اسلامی آداب کی تعلیم و تربیت۔

(۵) عربی زبان کے بنیادی الفاظ‘ ترکیبوں‘ محاوروں اور جملوں کو پڑھنے اور بولنے کی پختہ تربیت۔

اور پھر بچے اسے جس یکسوئی‘ شوق اور توجہ سے پڑھتے ہیں اور فر فر سناتے ہیں‘ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تین چار سال کی مسلسل محنت اور ریاضت کے نتیجے میں اسلامی تعلیم و تربیت کے مذکورہ بالا مضامین میں ایسی اچھی استعداد اور صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں جسے بنیاد بنا کر اگلے تعلیمی مرحلے میں ان کی بہتر اور معیاری تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

سالِ اوّل کے پہلے مضمون میں جمود

اس کے بعد بچوں کی ایک بڑی تعداد عربی زبان سیکھنے اور اسلامی تعلیم کے حصول کی غرض سے اسلامی مدارس میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ سالِ اوّل کا تعلیمی نصاب پڑھتے ہیں' جس کا سب سے اہم اور پہلا مضمون ترجمہ قرآن کریم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی تدریس یوں ہوتی ہے کہ سبق کے آغاز پر ایک طالب علم مقررہ آیاتِ کریمہ تلاوت کرتا ہے' پھر معلم ان کا مقامی زبان میں ترجمہ سکھاتا ہے۔ وہ ان کا ترجمہ کرتے ہوئے ان میں مذکور مشکل الفاظ اور ترکیبوں کی حسبِ ضرورت تشریح بھی کرتا جاتا ہے۔ طلبہ اس ترجمہ اور تشریح کو نہایت توجہ اور انہماک سے سنتے اور یاد کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کے اس نہج سے انہیں متعدد تعلیمی و تربیتی فوائد حاصل ہوتے ہیں:

(۱) وہ قرآن کریم کی آیات کا معنی اور ترجمہ سیکھ لیتے ہیں۔

(۲) وہ قرآن کریم کے فہم و مطالعہ کی قدرت حاصل کر کے اس کے ارشادات اور احکام کو خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے اہل ہوتے ہیں۔

(۳) وہ قرآن کریم کے الفاظ اور تراکیب کی لغوی اور صرفی و نحوی تشریح سے واقف ہوتے ہیں۔

ترجمہ قرآن کی ایسی تدریس سے ہمارے بچوں' نوجوانوں اور علماء کو مذکورہ بالا فوائد اور نتائج تو حاصل ہوتے ہیں' لیکن یہ فوائد محدود اور ناکافی ہیں اور ہمارے عزیز بچوں کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم و تربیت کے تمام اہداف اور مقاصد کا احاطہ نہیں کرتے۔ اس لیے یہ طریقہ تدریس کچھ مفید ہونے کے باوجود ناقص ہے' اور اس ناقص اور جامد طریقہ تدریس کا تسلسل زیر تعلیم طلبہ میں جمود پیدا کرتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری درس گاہوں میں تعلیم قرآن کریم کا یہ عظیم ترین مضمون اس کی آیاتِ کریمہ کا لفظی ترجمہ رٹنے اور رٹانے تک محدود رہتا ہے' جو تین چار سال تک کسی تبدیلی یا ترقی کے بغیر اسی نہج پر چلتا رہتا ہے' اور ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ اس کی تدریس کے دوسرے سال یا اگلے سالوں میں' جب زیر تعلیم طلبہ کی تعلیمی صلاحیت اور فکری و علمی معیار بڑھ جاتے ہیں' اس کے تدریسی نہج کو ترقی دیتے ہوئے اس میں مزید تعلیمی و تربیتی مقاصد کو شامل کر لیا جائے۔

ترجمے پر انحصار اور عربی زبان سے لاتعلقی

اس جامد طریقہ تدریس نے ہمارے پورے تعلیمی ڈھانچے کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ درسِ نظامی کے تمام مضامین کی تدریس شروع سے لے کر آخر تک اسی نہج پر ہوتی ہے۔ اس نے ہمارے تمام طلبہ و طالبات' مدرسین اور علماء کو قرآن کریم کی زبان ''لسان عربی مبین'' سے لاتعلق کیا ہوا ہے اور وہ اس کے فہم و مطالعہ سے محروم رہتے ہیں۔ انہیں نہ تو قرآن کریم کے الفاظ' تراکیب اور محاوروں میں تدبر اور غور و فکر کی تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے لکھنے' بولنے اور متنوع استعمالات کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس طرح وہ کتاب اللہ کے حافظ اور عالم ہونے کے باوجود عربی زبان میں کوئی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتے۔ یوں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں اس جمود اور کاہلی نے عرصۂ دراز سے ہمارے عزیز بچوں' نوجوانوں' مدرسین' علماء' مفکرین اور تمام تعلیم یافتہ طبقوں کو عربی زبان سے لاتعلق اور محروم کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ طریقۂ تدریس جو ہمارے ملک کے تمام اسلامی مدارس میں جاری و ساری ہے' ناقص اور مضر ہے۔ **ضرہ اکبر من نفعه**۔ اس کے مضر اثرات کی مزید تفصیل ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

چنانچہ سال اوّل کا یہ نقص اگلے تعلیمی مراحل میں بھی تعلیم و تربیت کے مقاصد کو متأثر کرتا ہے اور پورے درسِ نظامی کو سالِ اوّل سے لے کر سالِ ہشتم تک عربی زبان و ادب سے لاتعلق رکھتا ہے۔ اس پر عظیم مفکر شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

خشتِ اوّل کو سیدھا کریں

یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے کہ قرآن کریم کی عربی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے اور اس کی آیاتِ کریمہ میں آسان اور مشہور الفاظ' مختصر اور عام فہم محاورات' تراکیب اور جملوں کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ ہم زیر تعلیم بچوں کے مرحلے اور معیار کے مطابق ان سے ایسا انتخاب کر سکتے ہیں جو انہیں قرآنی عربی زبان کے فہم' نطق' تحریر اُور سماع کی اچھی تربیت دے اور انہیں گرامر کی بھول بھلیوں میں نہ ڈالے۔ اس طرح بچے قرآن کریم کے ترجمہ یا فہم و مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے عربی لغت کے فہم و مطالعہ' بول چال اور تحریر کی تربیت پائیں گے' اور سالِ اوّل ہی سے عربی زبان کے پڑھنے' لکھنے اور بولنے کی مشق کرنے لگیں گے' جو ان کے ذہنوں اور دلوں میں عربی زبان و ادب کے اچھے ذوق کی بنیاد بنے گی۔

یہ ہمارے مدارس کا پہلا تعلیمی سال ہے۔ کمسن بچے بڑے شوق سے اور اچھے اچھے جذبوں کے ساتھ عربی زبان سیکھنے اور اسلامی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں اور اپنا تعلیمی سفر شروع کرتے ہیں۔ یہ ان کی بہتر تعلیم اور عمدہ تربیت کی بنیاد رکھنے کا سنہری وقت ہوتا ہے۔ آیئے ہم اس کا آغاز قرآن کریم کی معیاری اور مثالی تعلیم سے کریں۔

بچے خواہ مدارس کے عربی کورس میں داخلہ لیں یا تجوید القرآن کریم یا تحفیظ القرآن کریم کورس میں داخل ہوں‘ ان سب کو اپنے اپنے مضمون ترجمہ قرآن کریم/تجوید/تحفیظ کے ساتھ ساتھ لغت قرآن کریم کی تعلیم وتربیت ضرور دی جائے۔

کمسن بچے اور قرآنی عربی زبان کی تعلیم

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی مدارس کے طلبہ خواہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے ہوں‘ حفظ کرتے ہوں یا تجوید وقراءت کی تعلیم وتربیت پا رہے ہوں‘ وہ سب قرآنی آیات اور سورتوں کو بار بار اور تکرار سے پڑھتے رہتے ہیں‘ جس سے انہیں قرآن کریم کے الفاظ‘ ترکیبات‘ استعمالات اور جملے زبانی یاد ہو جاتے ہیں۔ یوں ان کے ذہنوں میں عربی زبان کا نہایت وسیع اور عمدہ ذخیرۂ لغت محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ جمع شدہ مواد ان بچوں کو عربی زبان کی تعلیم وتربیت دینے کی ایک اچھی بنیاد بن سکتا ہے۔ لہٰذا طلبہ کی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی لسانی اور فکری تربیت بھرپور انداز میں کیجیے‘ کیونکہ یہ دین اسلام کے طالبانِ علم ہیں اور انہیں عربی زبان کی عمدہ اور مؤثر تعلیم وتربیت دینے کا یہ بہت سنہری موقع ہوتا ہے۔

عربی زبان کی تدریس کا موزوں ترین موقع

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ بغدادی قاعدہ رٹنے کے بعد قرآن کریم کو حفظ کرنے والے بچوں کو عربی زبان کی تعلیم دینے کا یہ ایسا آسان اور عمدہ موقع ہوتا ہے جس کی مثال دوسری زبانوں کے تدریسی پروگراموں میں نہ ملے گی۔ اب یہ ہمارے تعلیمی نظام‘ مدارس اور معلمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس آسان‘ مثالی اور عمدہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلبہ کے لیے عربی زبان کی اچھی اور عمدہ تدریس کا اہتمام کریں۔

قرآنی عربی زبان کی تعلیم کیسے دی جائے؟

میں اپنی تجاویز کے مطابق پہلے سورۃ الفاتحہ کی تدریس کی مثال بیان کر چکا ہوں‘ اب

یہاں سورۃ البقرۃ کی پہلی پانچ آیات کریمہ کی تدریس کی مثال پیش کرتا ہوں۔

(۱) **شرح الکلمات**: معلم ہر سبق کے شروع میں مقررہ آیات کریمہ کے الفاظ اور تراکیب کی لغوی تشریح کو تختہ سیاہ پر لکھے تاکہ بچے اسے یاد کریں اور اپنی کاپیوں میں درج کریں:

سُورۃ ج سُوَر : سورت
الصَّلٰوۃ ج صَلَوَات : نماز

ذٰلِکَ ج اُولٰئِکَ وہ
رَزَقْنٰـھُمْ: ہم نے انہیں دیا
رَزَقَ یَرْزُقُ رِزْقًا : دینا

الْکِتٰبُ ج کُتُب : کتاب
یُنفِقُوْنَ : وہ خرچ کرتے ہیں
اَنْفَقَ یُنْفِقُ اِنْفَاقًا : خرچ کرنا

ھُدًی (ھَدَی یَھْدِی ھُدًی): ہدایت
یُوْقِنُوْنَ: وہ یقین کرتے ہیں
اَیْقَنَ یُوْقِنُ اِیْقَانًا : یقین کرنا

لِّلْمُتَّقِیْنَ م مُـتَّقِیْ : پرہیزگار
الْمُفْلِحُوْنَ م مُفْلِح : فلاح پانے والے

یُؤْمِنُوْنَ : وہ ایمان لاتے ہیں
اٰمَنَ یُؤْمِنُ اِیْمَانًا (بِ) : ایمان لانا
یُقِیْمُوْنَ: وہ قائم کرتے ہیں
اَقَامَ یُقِیْمُ اِقَامَۃً : قائم کرنا

(۲) **ترجمۃ الآیات وشرحھا** : اس کے بعد معلم ان آیات کریمہ کا مقامی زبان میں ترجمہ کرے اور بچوں کے معیار کے مطابق ان کی تشریح کرے۔

(۳) **التمرینات المتنوعۃ** : اب معلم ان آیات کریمہ پر متنوع سوالات کو حل کرنے کی مشقیں زبانی اور تحریری دونوں طرح حل کرائے۔

(۱) اکتب اضداد الکلمات الآیۃ: ویکون الجواب:

مدنیۃ	مدنیۃ ضدھا مکیۃ
الکافر	الکافر ضدہ المؤمن
الدنیا	الدنیا ضدھا الآخرۃ
الغیب	الغیب ضدہ الشھادۃ
السماء	السماء ضدھا الارض

امام	**امام ضده خلف**
قبل	**قبل ضده بعد**

(٢) املأ الفراغ بكلمة مناسبة فيما يأتى :

١۔ سورة الفاتحة .... و سورة البقرة مدنية

٢۔ المؤمنون يؤمنون ....

٣۔ ويقيمون ....

٤۔ وينفقون .... اموالهم

٥۔ ويؤمنون .... انزل على محمدﷺ

٦۔ ويؤمنون .... انزل من قبله

(٣) املأ الفراغ بكلمة مناسبة فيما يأتى :

١۔ هو	آمن	**بالله**
٢۔ هما	....	**بالله**
٣۔ هم	....	....
٤۔ هى	....	....
٥۔ هما	....	....
٦۔ هن	....	....
٧۔ انت	....	....
٨۔ انتم	....	....
٩۔ انا	....	....
١٠۔ نحن	....	....

(٤) أجب عما يأتى:

١۔ من خلقنا؟

٢۔ من خلق السماء؟

٣۔ من خلق الارض؟

٤۔ من خلق العالم؟

٥۔ من انزل القرآن الکریم؟

٦۔ علی من اُنزل القرآن الکریم؟

(٥) الخِّصْ معنی ھذه الآیات الکریمة بعبارتك.

الجواب: ذکر اللہ سبحانه وتعالی فی ھذه الآیات الکریمة انه انزل ھذا القرآن لیھدی الناس الی الصراط المستقیم، وذکر خمس صفات لعبادہ المؤمنین، وھی:

١۔ انھم یؤمنون بالغیب؟

٢۔ ویقیمون الصلاة،

٣۔ وینفقون من اموالھم فی سبیل اللّٰہ،

٤۔ ویؤمنون بما انزل علی محمد ﷺ وما انزل قبله،

٥۔ ویؤمنون بالآخرة.

وھولاء، علی الحق وھم المفلحون. اللھم اجعلنا منھم، آمین.

فوائد: آپ دیکھتے ہیں کہ اس طریقہ تدریس میں زیر تعلیم بچے ترجمہ قرآن کے ساتھ ساتھ پہلے مقررہ آیات کریمہ میں مستعمل الفاظ کی اچھی لغوی تشریح لکھتے اور یاد کرتے ہیں اور پھر قرآن کریم کی لغت کو لکھنے، بولنے اور سننے کی متنوع اور عمدہ مشقیں کرتے ہیں، جو ان کے ذہنوں میں عربی زبان وادب کی اچھی بنیاد بنے گی اور کتاب اللہ کے اعلیٰ فہم و تدبر کی اہلیت پیدا ہوگی جو مستقبل میں ان کی تعلیمی اور علمی ترقی کا ذریعہ ہوگی۔

شعبہ تجوید اور تحفیظ میں تین پاروں کی تدریس کرائی جائے

ہماری درس گاہوں میں اس وقت شعبہ تحفیظ القرآن الکریم اور شعبہ تجوید القرآن الکریم کے طلبہ کو کسی طرح کے فہم کے بغیر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی نتیجے میں وہ عمر بھر اس کے فہم سے محروم رہتے ہیں اور امام اور مُقری ہونے کے بعد بھی اس کی لغت اور معانی کو سمجھے بغیر پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ تمام علماء اور معلمین تسلیم کرتے ہیں، یہ امر کسی طرح بھی مستحسن نہیں ہے۔ اس لیے ان دونوں شعبوں کے طلبہ کو بھی کم از کم تین پاروں کی تدریس ضرور کرائی جائے۔

میرے اس مجوزہ طریقۂ تدریس پر عمل کرنے سے ان کے ذہنوں میں قرآن کریم کے اچھے فہم و مطالعہ کی راہ ہموار ہوگی، جس سے انہیں ان مضامین یعنی تجوید اور حفظ میں بھی بڑی

آسانی ہو جائے گی کہ وہ اب قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھیں گے تو نسبتاً کم مدت میں حفظ کر سکیں گے اور فراغت کے بعد مستقبل میں اپنی ذمہ داریوں کو فہم وبصیرت کے ساتھ ادا کرنے کے اہل ہوں گے' اور ضرورت کے وقت آسانی سے علومِ اسلامیہ کے شعبوں میں داخلہ لے کر مزید ترقی کر سکیں گے۔

میں اپنے طویل غور وفکر اور تجربات کی روشنی میں تعلیم وتربیت کی یہ تجویز اسلامی مدارس کے اربابِ اختیار' مدرسین' علماء اور وفاقوں کے افسرانِ بالا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ تجویز آسان اور قابل عمل ہے۔ اس کے نفاذ سے ہمارے اداروں کے تعلیمی نظام میں ایسا انقلاب آئے گا جو ان کی ترقی کا ذریعہ بنے گا اور ہمارے فاضل اساتذہ اور معلمین بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ ان شاء اللّٰہ تعالیٰ وھو الموفق والمستعان۔

کیا یہ طریقہ تدریس قابل عمل ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس اور جامعات کے موجودہ حالات میں جب ہمارے معلمین اور طلبہ میں بالعموم عربی زبان بولنے اور لکھنے کا ذوق ناپید ہے اور ہمارے ملک اور ماحول میں ایسی کتابیں اور گائیڈز بھی موجود نہیں ہیں جو تعلیم وتدریس کے اس جدید طریقے میں معاون اور مفید ہوں' تو ہم اس طریقہ تدریس پر عمل کیسے کریں؟

اصولی طور پر یہ طریقۂ تدریس آسان' فطری اور قابل عمل ہے۔ پہلے ہمیں اپنے فاضل اور محنتی معلمین اور طلبہ کو اس کے فوائد اور دوررس نتائج اور ثمرات سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے نفاذ اور ترویج کی اہمیت کو واضح کرنا چاہیے۔ معلمین کو دعوت دی جائے بلکہ انہیں شوق اور ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی عظیم درسگاہوں اور اپنے عزیز بچوں کی ترقی کے اس پروگرام پر عمل کرنے کی تیاری کریں اور اپنے ماحول اور ادارے میں عربی زبان کو بولنے اور لکھنے کی روایت اور صلاحیت کو بیدار کریں۔ ان میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن کبھی استعمال نہ کرنے سے خوابیدہ رہتی ہے۔ اصولی طور پر تو یہ حضرات قرآن کریم کے وسیع ذخیرۂ لغت کے حافظ ہوتے ہیں' اس کے علاوہ وہ حدیث شریف کی صحاح ستہ' عظیم فقہی متون' عربی زبان وادب کی متنوع کتابوں کے سمندر ناپیدا کنار کے عالم وفاضل ہوتے ہیں اور انہیں اس سمندر کے ہیروں جیسے بے شمار محاورے' استعمالات' جملے' اصطلاحات' لطیفے' اشعار اور عبارتیں ازبر ہوتے ہیں۔ ان کی اس عظیم لسانی اور فکری اہلیت وصلاحیت کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس بارے میں

ہمارے اداروں، منتظمین اور اساتذہ کو خواہ مخواہ احساسِ کہتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ پورے شوق اور عزم کے ساتھ محنت سے اس نقص کا ازالہ کرنا چاہیے۔ اس بارے میں مزید تجاویز یہ ہوسکتی ہیں:

(۱) اپنے ادارے میں ایک دو گھنٹے کا ایسا وقت مقرر کر دیں جس میں تمام معلمین اور زیرِتعلیم بچے صرف عربی زبان میں ہی بات کریں۔ مثلاً **بعد صلاۃ المغرب حتی صلاۃ العشاء** یا صبح **من بعد صلاۃ الفجر حتی الساعۃ الثامنۃ.** منتظمین ایسے کسی پروگرام کی سرپرستی کریں اور معلمین اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں معاون کتابیں اور گائیڈز فراہم کریں۔ اس بارے میں ہمارا رسالہ **کلمات مستعملۃ فی بیئۃ مدرسیۃ** (درس گاہ کے ماحول میں مستعمل عربی الفاظ اور محاوروں کا انتخاب) **للبنین یا للبنات** مفید رہے گا۔

(۲) قرآن کریم کی تعلیم کے سبق میں اس طریقۂ تدریس کو فوراً شروع کر دیں۔ اس کی تدریس کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لیے اس کی ایک دن پہلے تیاری کر کے آئیں۔ شروع میں کافی دِقت پیش آئے گی اور کچھ غلطیاں ہوں گی۔ ان سے بددل نہ ہوں۔ راہنمائی کے لیے ہماری کئی مطبوعات مثلاً **مفتاح الانشاء الجزء الاول والجزء الثانی** معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان شاء اللہ!

(۳) ہر معلم سے درخواست کریں کہ وہ کم از کم اپنا ایک سبق عربی زبان میں ضرور پڑھائے جس سے ان کی اپنی صلاحیت میں اضافہ ہوگا اور بچوں کی تربیت اور مشق ہوگی۔

مرشد تدریس القرآن کی تیاری

آخر میں یہ خوشخبری دینا چاہتا ہوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے **معھد اللغۃ العربیۃ** میں کئی سال سے اس طریقۂ تدریس کے مطابق قرآن کریم کی تدریس کر رہے ہیں اور معلمین کے لیے اس کی گائیڈ **مرشد تدریس القرآن الکریم** کی تیاری کا کام ہو رہا ہے جس کے پہلے اجزاء جلد طبع ہو جائیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ وبیدہ التوفیق ۔

۞۞۞

اسلام میں طلاق کا قانون اور اس کا فلسفہ

مولانا سید شہاب الدین ندوی مرحوم☆

اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات ونباتات کو جوڑا جوڑا بنا کر پیدا کیا ہے' یعنی تمام جانداروں کو نر و مادہ کے روپ میں ڈھالا ہے' تا کہ ان کے ملاپ سے ان کی نسلیں مشیتِ الٰہی کے تحت تسلسل کے ساتھ جاری رہیں۔ جدید تحقیقات کے مطابق یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پیڑ پودوں میں بار آوری کا یہ عمل نہایت درجہ حیران کن طریقوں سے عمل میں آتا ہے جو کارسازِ عالم کی ربوبیت اور اس کی کرشمہ سازیوں کا ایک انوکھا روپ ہے۔ حیوانی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر نوع اور ہر صنف میں ایک دوسرے کے لیے کشش والفت رکھ دی ہے تا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچ سکیں اور ان کے درمیان میل وملاپ کا سلسلہ جاری رہے۔ مگر جہاں تک نوعِ انسانی کا تعلق ہے اس پر خالق کائنات نے چند قیود و پابندیاں عائد کر کے دیگر انواعِ حیات کے برعکس آزاد جنسی تعلق کو ممنوع قرار دیا ہے۔ کیوں کہ انسان محض ایک حیوان یا کوئی پیڑ پودا نہیں بلکہ اشرف المخلوق ہے' جس کو ذہنی واخلاقی شعور سے بھی سرفراز کیا گیا ہے اور اسی ذہنی واخلاقی شعور کی بنا پر اسے ایک ذمّہ دار اور مہذب ہستی قرار دیا گیا ہے' جبکہ اس منصب سے دیگر تمام انواعِ حیات محروم ہیں۔

مجرد جنسی لذت طلبی ممنوع ہے

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لیے جب آزاد جنسی تعلق کو ممنوع قرار دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اب ایک محدود ازدواجی زندگی گزارے اور اس کے لیے اس نے نکاح کا ضابطہ تجویز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام آسمانی مذاہب میں لوگوں کو نکاح کی ترغیب دی گئی ہے اور ''سفاح''، یعنی بغیر نکاح کے کسی عورت سے جنسی تعلق قائم کرنے (زناکاری) سے منع کیا گیا

☆بانی فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مردوں اور عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو محض جنسی لذت کی خاطر بے راہ روی میں مبتلا ہوں اور آزاد جنسی تعلقات کے خواہش مند ہوں یا محض تنوع اور لطف اندوزی کی خاطر میاں بیوی کو طلاق دینے والا اور بیوی میاں سے طلاق طلب کرنے والی ہو۔ چنانچہ ارشاد رسول ﷺ ہے:

''اللہ لعنت کرے جنسی چسکہ اُٹھاتے رہنے والے مردوں اور ایسی عورتوں پر۔''

غرض اسلام میں جس طرح آزاد جنسی تعلق اور خفیہ آشنائی و داشتہ گری کی ممانعت ہے اسی طرح جنسی عیاشی کی خاطر اپنی منکوحہ عورت کو بلا وجہ طلاق دے کر کسی دوسری عورت سے بیاہ رچانا بھی سخت ناپسندیدہ فعل ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں جہاں محرمات (وہ عورتیں جن سے کسی صورت میں نکاح نہ ہوسکتا ہو) کا بیان آیا ہے وہاں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ باقی عورتیں (غیر محرمات) صرف اسی صورت میں حلال ہوسکتی ہیں جب کہ وہ قید نکاح میں آچکی ہوں۔ یعنی آزاد شہوت رانی نہ پائی جاتی ہو۔

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ا﴾

(النسا:۲۴)

''اور ان (محرمات) کے سوا باقی عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں' اس طرح کہ مال خرچ کر کے ان سے نکاح کر لو' بشرطیکہ اس سے مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ کہ شہوت رانی کرنا۔''

اس کی مزید وضاحت سورۃ المائدہ میں اس طرح کی گئی ہے:

﴿اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ا﴾

(آیت:۵)

''جب کہ تم ان عورتوں کے مہر انہیں دے دو' اس طور پر کہ تم قید نکاح میں آجاؤ' نہ کہ بدکاری کرنے والے اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والے۔''

زناکاری میں معاشرے کی تباہی

اس اعتبار سے اسلامی شریعت میں نکاح کی ترغیب دی گئی ہے اور بے نکاحی جنسی تعلقات یعنی زناکاری کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اسلام میں زناکاری ایک سخت ترین معاشرتی گناہ اور قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اس فعلِ بد میں مبتلا ہو جائے تو اس کی سزا ان دونوں کی سنگساری ہے۔ لہٰذا اپنی جنسی خواہش کو پورا کرنے کے

لیے اسلام مرد اور عورت کو حلال طریقہ اختیار کرنے یعنی نکاح کا ذریعہ اپنانے کی تاکید کرتا ہے تاکہ معاشرے میں بداخلاقی اور جنسی مفاسد فروغ نہ پائیں جو اس معاشرہ کی تخریب و تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب معاشرے میں آزاد جنسی تعلقات یا زنا کاری کا دور دورہ ہوتا ہے تو اس سے خاندانی نظام ٹوٹ جاتا ہے' لاوارث اور حرامی بچوں کی بہتات ہو جاتی ہے' افراد اور معاشرہ کی اخلاقی حالت گر جاتی ہے اور وہ بہت سے امراضِ خبیثہ کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ آج مغربی ممالک میں جنسی انارکی اور انتشار کی بدولت حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو اعداد و شمار ہمارے سامنے آئے ہیں وہ حد درجہ ہولناک ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام میں آزاد جنسی تعلقات یا زنا کاری کی سخت سے سخت سزا تجویز کی گئی ہے تاکہ لوگوں کو اس سے عبرت حاصل ہو اور اس کی بُرائی لوگوں کے دل و دماغ میں بیٹھ جائے۔

طلاق کا جواز اور اس کی حکمت

جس طرح نکاح ایک سماجی بندھن ہے جو مرد اور عورت کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے اسی طرح طلاق ایک ایسا اعلان ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیتا ہے۔ نکاح کا مقصد گھریلو تعلقات کی استواری اور طرفین کا اپنی اپنی ذمہ داریوں کو خوش اُسلوبی کے ساتھ ادا کرتے رہنا ہے' مگر بعض اوقات اختلافِ مزاج یا طرفین میں سے کسی کی ظلم و زیادتی یا دیگر وجوہات کی بنا پر اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرتے رہنا ممکن نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں جب معاملہ حد سے بڑھ جائے اور کسی اصلاح کی امید ہی باقی نہ رہ جائے تو پھر شریعت اجازت دیتی ہے کہ طلاق یا خلع کے ذریعہ اس معاشرتی بندھن سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی زیادہ بہتر ہوتا ہے تاکہ مزید خرابیاں پیدا نہ ہونے پائیں۔ اسلام قدیم عیسائیت اور قدیم ہندومت کی طرح طلاق کو قانوناً ناجائز قرار نہیں دیتا' جن کی نظروں میں طرفین کو سوائے موت کے کوئی چیز ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ نکاح سے مقصود ازدواجی تعلقات کی خوش گواری اور خاندانی و عائلی نظام کی استواری ہے' مگر جب ازدواجی تعلقات بے کیف ہو جائیں یا عائلی نظام میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو پھر ایسا بندھن کس کام کا جو ایک رِستا ہوا ناسور اور معاشرہ کا پھوڑا بن جائے؟ ظاہر ہے کہ نکاح کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کسی نہ کسی طرح رشتے میں بندھے رہیں خواہ ان کے باہمی تعلقات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ طبیعتوں اور مزاجوں کا اختلاف ایک امر واقعہ ہے۔ اس

کے علاوہ بعض مخصوص سماجی عوامل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس اختلاف کو اور زیادہ ہوا دینے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً طرفین کے خاندانی روابط میں بگاڑ اور ایک دوسرے کے ساتھ مخالفانہ و مخاصمانہ رویہ وغیرہ۔ اور بعض اوقات یہ تمام اسباب اور عوامل مل کر مرد کو طلاق دینے پر اور عورت کو خلع حاصل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسلام چونکہ ایک فطری و عقلی دین ہے اس لیے اس کے تمام احکام بھی علم و حکمت سے لبریز ہیں۔ چونکہ اسلام نے آزاد جنسی تعلق یا زنا کاری کو حرام اور قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے لہٰذا جب میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جائیں اور ان دونوں میں کسی بھی طرح صلح نہ ہو سکے تو بہتر یہی ہے کہ ان دونوں کا راستہ الگ الگ کر دیا جائے' ورنہ ظاہر ہے کہ اس کشیدہ اور ابتر صورت میں بھی زبردستی ان دونوں کو باندھ کر رکھنے کا نتیجہ زنا کاری یا خفیہ جنسی تعلق کا دروازہ کھولنا ہوگا۔ مگر اسلام نے چونکہ پہلے ہی اس پر بندش لگا دی ہے تو اب دوسرا راستہ سوائے طلاق کے اور کچھ نہیں ہے اور اسی میں ان دونوں کا بھلا ہے۔ یہ ہے اسلام میں عقلی اعتبار سے طلاق کی حکمت۔

طلاق ایک ناپسندیدہ چیز

اس موقع پر یہ بات بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نکاح اگرچہ بظاہر ایک معاشرتی و عمرانی معاہدہ نظر آتا ہے مگر درحقیقت وہ دیگر تمدنی معاملات کے برعکس تعبدی حیثیت کا حامل بھی دکھائی دیتا ہے' کیوں کہ وہ ایک اعتبار سے سنت و عبادت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یعنی اس میں یک گونہ مذہبی تقدس کا عنصر بھی شامل ہے۔ اسی وجہ سے دیگر تمدنی معاملات کے برعکس نکاح کے بندھن کو بلا وجہ توڑنا یعنی طلاق دینا اسلام کی نظر میں سخت ناپسندیدہ بات ہے۔ کیوں کہ وہ حقیقتاً دو خاندانوں کے بگاڑ کا سبب ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات معاشرے میں سخت قسم کا انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند حدیثیں ملاحظہ ہوں:

> ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ کسی چیز کو حلال نہیں کیا۔'' (ابوداوٗد)

> ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! اللہ نے روئے زمین پر غلام کو آزاد کرنے سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز پیدا نہیں کی اور اسی طرح روئے زمین پر طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی دوسری چیز بھی پیدا نہیں کی۔'' (دارقطنی)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے سخت ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔'' (تفسیر قرطبی)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نکاح کرو اور طلاق مت دو۔ کیوں کہ طلاق کی وجہ سے عرش ہلنے لگتا ہے۔'' (ایضاً)

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلام میں نکاح کی حیثیت نہ تو قدیم عیسائیت اور ہندومت کی طرح ''جنم جنم کا بندھن'' ہے کہ جو صرف موت سے ختم ہو اور نہ محض ایک تمدنی سماجی بندھن ہے کہ جب چاہا معاہدہ کرلیا اور جب چاہا توڑ دیا۔ بلکہ ''ذوّاقیت'' یا محض لطف اندوزی کی خاطر نکاح کرتے رہنا سخت مذموم ومعیوب ہے' جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

''عورتوں کو طلاق مت دو سوائے کسی (قوی) شبہ کے۔ کیوں کہ اللہ محض جنسی مزہ لینے والے مردوں اور جنسی مزہ لینے والی عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (ایضاً)

طلاق کب جائز اور کب ناجائز ہے؟

حاصل کلام یہ ہے کہ طلاق دینے کے معاملے میں سخت احتیاط اور توازن کی ضرورت ہے' طلاق نہ دینے کی صورت میں جس طرح خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں اسی طرح طلاق دینے کی صورت میں بھی بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا طلاق دینے سے پہلے ان دونوں پہلوؤں پر ہر اعتبار سے غور کرلینا ضروری ہے۔ طلاق کی چار قسمیں ہیں' جو یہ ہیں:

(۱) واجب' (۲) مستحب' (۳) حرام' (۴) مکروہ

(۱) طلاق اُس وقت واجب ہوجاتی ہے جب میاں بیوی کے جھگڑے میں فیصلہ کرنے والے ثالثوں کی رائے یہ ہو کہ ان دونوں کو الگ کردینا ہی بہتر ہے۔

(۲) طلاق مستحب اس وقت ہوتی ہے جب میاں بیوی متفق نہ ہوں اور ان دونوں کے درمیان جھگڑا شدت اختیار کرلے۔ اس صورت میں گناہ سے بچنے کے لیے دونوں کا الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔

(۳) طلاق ناجائز یا حرام اُس صورت میں ہوتی ہے جب عورت مدخولہ (مباشرت کی ہوئی) ہونے کی صورت میں حیض کی حالت میں ہو یا ایسے طہر (عورت کی پاکی کی حالت) میں ہو جس میں وہ عورت سے مباشرت کرچکا ہے۔

(۴) طلاق مکروہ (ناپسندیدہ) اُس صورت میں ہوگی جب میاں بیوی کے تعلقات درست (نارمل) ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کر رہے ہوں۔ (بحوالہ تفسیر ابن جوزی)

اور بعض فقہا نے یوں لکھا ہے:

(۱) طلاق اُس وقت واجب ہو جاتی ہے جب مرد کسی جنسی عیب کی بنا پر اپنا وظیفہ طبعی ادا کرنے پر قادر نہ ہو یا عورت کا نفقہ (خرچہ) ادا نہ کر سکتا ہو' اس صورت میں عورت کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے لیے طلاق کا مطالبہ کرے اور ایسی حالت میں مرد پر شرعاً واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں عورت کو بد اخلاقی یا بے آبروئی میں مبتلا ہونے یا کسی مشکل میں پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

(۲) طلاق اُس صورت میں حرام ہوگی جب اس کی وجہ سے شوہر کو اپنی عورت یا کسی اجنبی عورت کے ساتھ حرام کاری میں مبتلا ہونے یا لوگوں کے حقوق غصب کرنے کا اندیشہ ہو۔

(۳) طلاق مکروہ اس صورت میں ہوگی جب وہ بغیر کسی سبب کے دی جائے۔ کیوں کہ ایسا کرنا اصلاً ناجائز ہے۔

(۴) طلاق مستحب اس وقت ہوگی جب وہ عورت بد اخلاق یا گستاخ ہو' یا نماز روزہ وغیرہ فرائض ترک کرنے والی ہو۔ (کتاب الفقہ)

طلاق کا حق مرد ہی کو کیوں؟

اس موقع پر ایک اہم سوال یہ ہے کہ طلاق دینے کا حق کس کو ہے؟ آیا مرد کو یا عورت کو یا دونوں کو؟ تو اسلام نے یہ حق اصلاً مرد کو دیا ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق سوچ سمجھ کر اس حق کو استعمال کرے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فطری اور طبعی اعتبار سے عورت کے مقابلے میں مرد میں تحمل، بُردباری اور دور اندیشی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے ہزار بار اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ لے گا کہ اسے طلاق دینی چاہیے یا نہیں؟ اور جب وہ طلاق دینے کا فیصلہ کر ہی لے گا تو اس کا یہ فیصلہ طویل غور و خوض کا نتیجہ ہوگا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد کے اوپر عورت کے مقابلہ میں ذمّہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ معاشی کفالت اور خبر گیری کا بوجھ بھی اسی کے کندھوں پر رہتا ہے اور صاحبِ اولاد ہونے کی صورت میں تو وہ سراپا ذمہ دار بن جاتا ہے' لہٰذا وہ طلاق دینے سے پہلے ان تمام پہلوؤں پر اچھی طرح سوچ لیتا ہے کہ اس اقدام کے نتیجے میں اسے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں۔ اس کے

برعکس اسلامی قانون کی رو سے چونکہ عورت پر معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے اس وجہ سے عورت کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر عورت کو بھی یہ حق دیا جاتا تو چونکہ وہ بہت زیادہ جذباتی ہوتی ہے اس لیے وہ بغیر غور وفکر کے بات بات پر طلاق دینا شروع کر دیتی اور بعد میں اسے پچھتانا پڑتا۔ مگر پھر بھی اسلام نے عورت کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اسے خلع کا حق دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی معقول بنیاد پر مرد سے علیحدگی کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی شریعت نے نہایت دانشمندانہ طور پر عورت اور مرد دونوں کی فطرت اور طبیعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حد درجہ منصفانہ اور مناسبِ حال احکام جاری کیے ہیں۔

طلاق ایک پرائیویٹ معاملہ

طلاق مرد اور عورت کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے‘ کیوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے راز داں ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر نوبت جب طلاق تک آ جاتی ہے تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ طلاق کے اسباب کو مخفی ہی رکھا جائے‘ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو معاشرہ میں طشت از بام نہ کیا جائے جس کی وجہ سے مزید خرابی اور مفسدہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اسلام نے ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے جو ہر فرد کا شخصی و ذاتی حق ہے۔ اب اس شخصی و انفرادی حق کو حکومت یا عدالت کی طرف منتقل کرنا اور طلاق کی ضرورت کو عدالت کے ذریعہ ثابت کروانے کی کوشش کرنا اسلام کی عطا کردہ شخصی و انفرادی آزادیوں کو چھیننے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید تو اس مسئلے میں صاف صاف کہتا ہے

﴿الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَةُ النِّکَاحِ ؕ﴾ (البقرہ:۲۳۷)

’’وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔‘‘

اور اس کی شرح میں ایک حدیث منقول ہے کہ عقدۂ نکاح کا مالک شوہر ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے۔ وہی طلاق دے سکتا ہے۔ (معارف القرآن)

غرض طلاق دینے یا نہ دینے کا اختیار صرف شوہر کو ہے اور یہ حق کسی اور کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح وہ کسی کی اجازت پر بھی موقوف نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اس صورت میں اس کا یہ شرعی حق چھیننا یا اس پر پابندی عائد کرنا ہوگا‘ جو جائز نہیں ہے۔

طلاق کا صحیح طریقہ اور اس کی حکمت

مذاہبِ عالم اور خصوصاً یہودیت وعیسائیت میں نکاح وطلاق کے ضوابط کے سلسلے میں جو سختیاں موجود تھیں یا ان میں جو کوتاہیاں ہوئیں، ان کے ازالے کے لیے اسلامی شریعت کو نہ صرف ایک کامل ضابطہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے بلکہ اسے ہر قسم کے نقص وعیب سے بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ طلاق دینے کے لیے متعدد شرائط رکھی گئی ہیں جن کو ملحوظ رکھنے کے باعث اوّل تو طلاق دینے کی نوبت ہی بہت کم آتی ہے اور اگر آتی بھی ہے تو پھر دی ہوئی طلاق واپس لے کر مطلقہ عورت کو دوبارہ اپنی بیوی بنانے کا موقع حاصل رہتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص کسی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہو جائے تو اسلامی قانون کے مطابق اس کا سنت طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق نہ دے بلکہ پاکی کی حالت میں دے۔ اور پاکی کی حالت میں طلاق دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس نے اُس دوران اپنی بیوی سے مباشرت نہ کی ہو، یعنی جس طُہر (عورت کی پاکی کی حالت) میں وہ عورت کو طلاق دے رہا ہے اُس میں اس سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دے۔ اسلامی شریعت ان دو بنیادی شرائط کو عائد کر کے دراصل مرد کو طلاق سے روکنا چاہتی ہے۔ وہ اس طرح کہ حیض کی حالت میں عورت سے مباشرت کرنا طبی نقطۂ نظر سے سخت نقصان دہ بات ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات عورت کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں، اسی بنا پر شریعت نے ایسی حالت میں مباشرت کو حرام قرار دیا ہے۔ ہر ماہ عورت کی یہ حالت ہفتہ عشرہ تک قائم رہتی ہے، جو مردوں پر زیادہ تر شاق گزرتی ہے اور وہ عورت کے پاک ہونے کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ اب چونکہ شریعت نے یہ شرط رکھی ہے کہ عورت کو اگر طلاق دینا ہے تو اس کی پاکی کی حالت میں اور بغیر مباشرت کے طلاق دو، تو اس شرط کو اکثر مرد پورا نہیں کر پائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ طلاق واقع ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ مذکورہ بالا طریقے سے طلاق دینے کو اسلامی شریعت میں ''طلاقِ سنت'' کہا گیا ہے۔ یعنی طلاق دینے کا صحیح اور مسنون طریقہ۔

اسی طرح طلاق کا سنت طریقہ یہ بھی ہے کہ طلاق دینا اگر ضروری ہو تو صرف ایک طلاق دی جائے (تین طلاقیں نہ دی جائیں) جس کی وجہ سے بعد میں عدت کے اندر رجوع کر کے (دی ہوئی طلاق واپس لے کر) مطلقہ کو پھر سے بیوی بنا لینے کا اختیار باقی رہتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص طلاق دے بھی دے تو ایک طلاق (اور اسی طرح دو طلاق) دینے کی صورت میں اُسے اپنے فعل پر شرمندہ ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ اس طرح شریعت نے قدم قدم پر

حکمت و مصلحت اور دانشمندی کا مظاہرہ کیا ہے تاکہ طلاق کی نوبت بہت کم آسکے۔ مگر تین طلاق ایک ساتھ یا ایک ہی طُہر میں یا حیض کی حالت میں دے دینا لوگوں کی جہالت ہے جس کی وجہ سے رجوع کا موقع باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ بیک وقت یا ایک ہی طہر میں یا حیض کی حالت میں تین طلاق دینے سے عورت فوری طور پر حرام ہو جاتی ہے جس کو اصطلاح میں ''طلاقِ مغلظہ'' کہتے ہیں، یعنی سخت طلاق۔ ایسی عورت کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ دوسرا نکاح کر کے دوسرے شوہر سے ہم بستری کے بعد طلاق حاصل نہ کرے، وہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوسکتی۔ یہ سخت ضابطہ شریعت نے اس لیے رکھا ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق ہرگز نہ دے بلکہ اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کرے۔ لیکن اگر وہ یہ سخت قدم اٹھائے گا تو پھر بیوی بھی بطورِ سزا اس پر حرام ہو جائے گی۔

تین طلاق کا فلسفہ

اسلامی شریعت میں طلاق کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ عورت کو سنت کے طریقے کے مطابق ایسے طُہر کی حالت میں جس میں اس نے مباشرت نہ کی ہو، صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔ دورانِ عدت مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے، جبکہ عدت کے بعد دوبارہ نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں ''طلاق احسن'' (سب سے اچھی طلاق) کہا جاتا ہے۔ طلاقِ سنت کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کے مطابق عورت کو تین طہروں میں تین (ہر طہر میں ایک ایک) طلاق بھی دی جا سکتی ہے اور اسے ''طلاق حسن'' (اچھی طلاق) کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں دوسری طلاق کے بعد تو عورت سے دوبارہ نکاح کیا جا سکتا ہے، مگر تیسری طلاق کے بعد عورت حرام (بائن مغلظہ) ہو جاتی ہے۔ یعنی رجوع کرنے کا حق صرف ایک یا دو طلاق تک ہی ہوتا ہے جب کہ تین طلاقوں کے بعد عورت حرام (بائن مغلظہ) ہو جاتی ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک طلاق دیتا ہے تو اسے عدت گزرنے سے پہلے رجوع کرنے کا حق حاصل رہتا ہے اور اسے اپنے فیصلہ پر غور و خوض کرنے کا بھی کافی موقع ملتا ہے، کیوں کہ یہ مدت تین ماہ کی ہوتی ہے جس میں عورت کی جدائی اس پر بہت شاق گزرتی ہے، مگر جب وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کرتا یا اس دوران (عدت کے اندر) اگر دوسری طلاق بھی دے دیتا ہے تو اس سے ظاہر ہوگا کہ اس نے عورت سے جدا ہونے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے اور اس بنا پر وہ مزید غور و خوض کو بیکار سمجھتا ہے، اس کا یہ رویہ دو طلاقوں سے بخوبی ظاہر ہو

جائے گا اور تیسری طلاق قطعی فیصلہ کر دے گی کہ اسے بیوی کی ضرورت ہے یا نہیں! (یہ بات طلاق حسن کی صورت میں ہوگی) اسی وجہ سے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۲۹)

''طلاق دو مرتبہ ہے' پھر یا تو معروف طریقے سے روک لینا ہے یا پھر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔''

یعنی طلاق رجعی دو بار ہے جس میں طلاق دینے والے کو غور کرنے کا کافی موقع مل جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقہ سے اس کو رخصت کر دیا جائے گا۔

اس طرح شریعت نے زیادہ سے زیادہ تین طلاقوں کی حد مقرر کی ہے اور اس میں بہت بڑی حکمت کارفرما ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تین سے زیادہ مرتبہ طلاق دینے کا اختیار دیا جاتا تو اس صورت میں طلاق مرد کے لیے ایک ہتھیار یا ایک کھلونا بن جاتی۔ اور تین سے کم کا اختیار دینے کی صورت میں غور وفکر یا اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا موقع باقی نہ رہتا۔ طلاق چونکہ اصلاً مکروہ ہے اسی وجہ سے تین کے اندر رجوع کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور تیسری طلاق کے بعد بیوی بطور سزا طلاق دینے والے پر حرام ہو جاتی ہے' کیوں کہ بیوی کے روپ میں اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا کی جو سب سے بڑی نعمت عطا کی تھی' اس کی اس نے صحیح قدر نہیں کی بلکہ اس نعمت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے تو اب اُسے اُس کے شرعی نتائج بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص خدا کی ایک نعمت کو حقارت سے ٹھکرائے بھی اور وہ اس سے چمٹا بھی رہے یا اس انتہائی اقدام کے باوجود اسے اس نعمت سے مستفید ہونے کا موقع بھی دیا جاتا رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خلافِ عقل بات ہوگی' لہٰذا اب اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی بیوی جب تک کسی دوسرے مرد کا منہ نہ دیکھ لے وہ پہلے کے لیے حلال نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے لیے عورت کی رضامندی کے علاوہ دوبارہ نئے سرے سے اور نئے مہر کے ساتھ نکاح ضروری ہے اور شریعت کا یہ پورا ضابطہ حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرا ہوا ہے۔

طلاق رجعی کی حکمت

طلاقِ رجعی (لوٹانے والی طلاق وہ جو تین سے کم ہو) میں نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ باقی رہتا ہے جب تک عدت ختم نہ ہو جائے' بخلاف طلاقِ بائن کے جس میں نکاح باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا

طلاق رجعی کی صورت میں شریعت نے مرد کو عورت کی عدت ختم ہونے سے پہلے رجعت کرنے (دی ہوئی طلاق کو واپس لینے) اور مطلقہ کو پھر سے بیوی بنا لینے کا اختیار دیا ہے۔ تاکہ اگر کسی نے جلد بازی میں یا کسی فوری جذبے کی وجہ سے طلاق دے دی ہو تو اس کی تلافی کا موقع باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے عدت کی حالت میں کسی غیر شخص کے لیے مطلقہ کو نکاح کا پیغام بھیجنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اس سے ان دونوں کی اصلاح پر اثر پڑ سکتا ہے۔

طلاق سے پہلے صلح صفائی

شریعت نے یہ تمام مصلحتیں نہایت درجہ دور اندیشی کے ساتھ رکھی ہیں تاکہ معاشرہ کی اصلاح اور سدھار کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے اور یہ ساری مصلحتیں ایک صحیح اور سچے مذہب ہی کی نشانی ہو سکتی ہیں۔ مگر آج کل عام طور پر طلاق دینے کا جو غلط طریقہ رائج ہو گیا ہے اس کی وجہ سے اصلاح اور نظر ثانی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ یعنی بیک لفظ یا بیک وقت تین طلاقیں دینا۔ اور اس طرح طلاق دینا اسلامی شریعت کی نظر میں خلافِ سنت اور سخت گناہ کا باعث ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میاں بیوی کا تعلق زندگی بھر کے لیے ہوتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار اور مونس وغم خوار ہوتے ہیں۔ زوجین میں سے ہر ایک میں اگر کچھ خامیاں ہوتی ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا دونوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ ورنہ زندگی کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر انسان میں سو فیصد خوبیاں ہی خوبیاں پائی جائیں اور وہ پوری طرح فرشتہ نظر آئے۔ لہٰذا قرآن مردوں کو حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اپنانے کی دعوت دیتے ہوئے عورتوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرنے اور ان کی بعض ناپسندیدہ عادتوں کو نظر انداز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ (سورۂ نساء: ۱۹)

لیکن پھر بھی اگر زوجین کے درمیان اختلاف برپا ہو جائے اور نزاع کی صورت اختیار کر لے تو اس وقت وہ حکم دیتا ہے کہ طرفین کی جانب سے ایک ایک پنچ بیٹھ کر ان دونوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں۔ (سورۂ نساء: ۳۵)

اگر اس کے باوجود بھی اصلاح نہ ہو تو پھر آخری چارۂ کار کے طور پر طلاق کی اجازت دیتا ہے، مگر تاکید ہے کہ سنت طریقے کے مطابق صرف ایک طلاق دی جائے، تاکہ بعد میں دوبارہ مصالحت اور ملاپ کی گنجائش باقی رہے۔ ورنہ تین طلاق سے رشتہ ازدواج پوری طرح منقطع ہو جاتا ہے۔

طلاق اصلاً فسادِ تمدن کا باعث

طلاق چونکہ حقیقتاً فسادِ معاشرت اور فسادِ تمدن کا باعث ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے اور اس فعل سے صرف شیطان اور اس کے کارندوں ہی کو خوشی ہو سکتی ہے۔ شیطان اور اس کے کارندے چاہتے ہیں کہ میاں بیوی میں پھوٹ پڑ جائے اور اس کے نتیجے میں ایک خاندان ٹوٹ کر تباہ ہو جائے۔ ایک خاندان چونکہ معاشرے کی ایک اکائی (یونٹ) ہوتا ہے لہٰذا جب کسی معاشرے کی اکائیاں بکھر جائیں تو پھر ظاہر ہے کہ ایسا معاشرہ پنپ نہیں سکتا۔ جیسا کہ آج مغربی ممالک کا حال ہے' جو طلاقوں کی کثرت بلکہ بھرمار کے باعث آج اپنے زوال کے انتہائی منازل طے کر رہا ہے' اور اس کے اعداد و شمار حد درجہ ہولناک ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی خاندان ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے تو اس سے طرح طرح کے معاشرتی فتنے پیدا ہوتے ہیں اور اخلاقی خرابیاں پھیلتی ہیں جو تمدن و معاشرے کے استحکام میں رخنے پیدا کرتی ہیں اور اس اعتبار سے بھی آج مغربی ممالک کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس سلسلے کی تیسری حقیقت یہ ہے کہ نکاح کے ذریعے دو بے گانہ خاندانوں کے درمیان نسبی اور سسرالی حیثیت سے جو نیا رشتہ قائم ہوا تھا اور ان دونوں کے درمیان جو اتحاد اور یگانگت پیدا ہوئی تھی وہ طلاق کی بدولت آنِ واحد میں ختم ہو جاتی ہے اور ان دونوں میں مستقل نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ابلیس کا کوئی کارندہ جب میاں بیوی کے درمیان پھوٹ اور نفاق پیدا کر کے ان دونوں کو جدا کر دیتا ہے تو ابلیس اس فعل کو اس کارندے کا ایک کارنامہ تصور کرتے ہوئے اس کی پیٹھ ٹھونکتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور وہ اپنے کارندوں کو بھیجتا ہے (تاکہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں)۔ تو ان میں اس کا مقرب ترین کارندہ وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ فتنہ گر ہو۔ چنانچہ جب کوئی کارندہ آ کر اسے یہ رپورٹ دیتا ہے کہ اس نے فلاں فلاں کام کیا ہے تو وہ کہتا ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ان میں کا ایک کارندہ آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی ہے تو وہ اسے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تو نے واقعی کچھ کام کیا ہے!'' (صحیح مسلم)

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بلا وجہ طلاق دینا تو درکنار' طلاق کا نام تک زبان پر لانے کی سخت ممانعت ہے۔ اسی بنا پر ہنسی مذاق کی طلاق کو بھی نافذ قرار دیا گیا ہے تاکہ کوئی بھولے سے

بھی اس کا تصور یا تلفظ نہ کرے۔ غرض طلاق پر بندش عائد کرنے کے جتنے بھی عقلی طریقے ممکن ہو سکتے تھے ان سب کو اسلامی شریعت نے اختیار کیا ہے۔

اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اسلامی شریعت ایک معیاری، معقول اور متوازن شریعت اور ایک سائنٹفک قانون ہے جو آزاد جنسی تعلقات اور ''ذوّاقیت'' (جنسی مزہ چکھتے پھرتے) پر پابندی عائد کرتے ہوئے صرف نکاح کے حدود میں اپنی جنسی خواہش پورا کرنے پر زور دیتی ہے اور غیر نکاحی طریقوں سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتے ہوئے ہر مرد اور ہر عورت کو پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر اُبھارتی ہے' اور طلاق کی اجازت سخت مجبوری کی حالت میں دیتی ہے جب کہ اصلاح معاشرہ کے نقطہ نظر سے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے یہ قانون ''دَورِ وحشت'' یا ''قرونِ مظلمہ'' کی کوئی یادگار نہیں بلکہ ایک معقول اور سائنٹفک قانون ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک زندہ ترقی یافتہ مذہب اور ایک صالح ومتوازن معاشرے کے لیے قانونِ طلاق کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی اکثر و بیشتر متمدن قومیں جو عصر حاضر تک اس قانون کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہیں' وہ بھی اب بیسویں صدی میں اسے قبول کرنے پر مجبور نظر آ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں عیسائیت اور ہندو مت کی واضح مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کا قانون اور رواج کوئی دقیانوسی چیز نہیں بلکہ موجودہ ترقی یافتہ دور کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اور اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے چودہ سو سال پہلے ایک مکمل' معقول اور سائنٹفک ضابطہ پیش کر کے عصر ِجدید کی بخوبی رہنمائی کی ہے اور موجودہ ترقی یافتہ دنیا کو جلد یا بدیر اس مکمل ضابطہ کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے' کیوں کہ یہ ضابطہ ہر قسم کے افراط وتفریط سے پاک' ایک جامع اور حکیمانہ ضابطہ ہے' جس میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس میں عورت پر ظلم یا اس کے حقوق پر دراندازی کا کوئی شائبہ بھی موجود نہیں ہے' جیسا کہ آج مخالفین ِاسلام بطور پروپیگنڈا کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ قانون آج اکثر صورتوں میں عورت کی جان بچاتا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں، جہاں جہیز کی وبا کے سبب سے ہزاروں عورتوں کو دن دھاڑے جلا کر یا گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا ہے۔ اگر ہندو مذہب میں طلاق کا قانون موجود ہوتا تو یہ صورت حال کبھی پیش نہ آتی' بلکہ بے کس ومظلوم عورتوں کی جان بچ جاتی۔

❁❁❁

سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام

پروفیسر عبدالعظیم جانباز

سرمایہ داری نظام اسلامی دنیا کی نہیں' یورپ کی پیداوار ہے۔ یہ نظام مشین کی آمد کا نتیجہ تھا۔ مشین یورپ میں اتفاق سے ایجاد ہوئی اور وہیں سے دنیا کے باقی حصوں میں پھیلی۔ دنیائے اسلام اُس وقت سرمایہ داری سے روشناس ہوئی جب اس نظام پر یورپ کا مخصوص رنگ پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ دوسری طرف اسلامی دنیا پر ادبار اور زوال کا غلبہ تھا اور اس میں ہر طرف جہالت' غربت اور پسماندگی کے آثار نمایاں تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی آمد سے اسلامی دنیا میں کچھ مادی ترقی بھی ہوئی جس نے بعض لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے' کیونکہ یہ اسلام کے کسی بنیادی اصول اور قانون سے متصادم نہیں۔ اسلام میں افراد کو ذاتی ملکیت کا جو حق حاصل ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

درحقیقت یہ اسلام پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اسلام اور سرمایہ داری کے اصولی اور بنیادی اختلاف کی وضاحت کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ سرمایہ داری نظام سودی کاروبار اور اجارہ داری کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے' مگر اسلام ان دونوں کے خلاف ہے اور اس نے آج سے پندرہ سو برس پیشتر ان کی حرمت اور ممانعت کا صاف صاف اعلان بھی کر دیا تھا۔ بلاشبہ سرمایہ دارانہ نظام کے ابتدائی دور میں انسانیت کو بڑا فائدہ پہنچا اور دنیا اس کی بدولت ترقی کی نئی منزلوں سے آشنا ہوئی۔ مادی پیداوار میں اضافہ ہوا' ذرائع نقل و حمل بہتر ہوئے' وسیع پیمانے پر قومی وسائل کا استعمال عام ہوا اور مزدوروں کا معیارِ زندگی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہو گیا۔ مگر سرمایہ داری کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا' کیونکہ اس کے فطری ارتقاء کے نتیجے میں دولت بتدریج سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آ گئی' جبکہ غریب اور مزدور اپنی جائیداد اور دولت سے محروم ہو گئے۔ اس سے سرمایہ داروں کو مزدور حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی' جن کی محنت کے طفیل ان کی دولت اور تجارت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں جو مادی ترقی اور خوشحالی حاصل ہوئی اسلام ان میں سے کسی کی نفی نہیں کرتا اور نہ وہ ان میں سے کسی کے خلاف ہے۔ لیکن اگر دنیائے اسلام میں سرمایہ داری کا ظہور ہوتا تو اسلام اس کو یونہی آزاد کبھی نہ چھوڑتا بلکہ ایسے قوانین اور اصول مرتب کرتا جن کی موجودگی میں استحصال کا کوئی خطرہ ہی نہ رہتا، خواہ اس کا باعث سرمایہ داروں کی بدنیتی ہوتی یا سرمائے کی ناگزیر طبعی خصوصیت! اسلام نے اس سلسلے میں ہمیں جو اصول دیا ہے، اس کی رو سے سرمایہ دار کے ساتھ مزدور کو بھی منافع میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ چنانچہ امام مالکؒ تو منافع میں مزدور کو مالک کے ساتھ مساوی حصے کا مستحق سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کے کمانے میں جتنا سرمایہ دار کے سرمائے کا حصہ ہے اتنا ہی مزدور کی محنت بھی دخل ہے، لہٰذا دونوں کو منافع میں سے مساوی حصہ ملنا چاہیے۔

فقہ کے اس اصول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کو معاشرتی انصاف کے قیام سے کس قدر گہری دلچسپی ہے۔ معاشرتی انصاف کے قیام کا یہ داعیہ اسلام میں کسی مادی ضرورت، مجبوری یا طبقاتی کشمکش (جو کہ بعض لوگوں کے نزدیک معاشی تعلقات کی ترقی اور بہتری کا واحد مؤثر عامل ہے) کے نتیجے میں نہیں اُبھرا تھا، بلکہ یہ سراسر اس کی اپنی داخلی تحریک کا ثمر تھا۔ ابتدائی دَور میں صنعت وحرفت نہایت سیدھی سادی ہوتی تھی اور لوگ زیادہ تر کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ اسلام کے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اگر اُس وقت محنت اور سرمائے کے باہمی رشتوں کو منضبط کیا جاتا تو ان کو ایک منصفانہ بنیاد مل جاتی اور ان میں وہ خرابیاں پیدا نہ ہوتیں جو یورپ میں رونما ہوئیں۔ ماہرینِ معاشیات ہمیں بتاتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام جب سے اپنے ابتدائی ''دورِ خیر'' سے نکل کر موجودہ ''دورِ شر'' میں داخل ہوا ہے، قومی قرضوں پر اس کا انحصار بہت بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ بینک قائم ہوئے اور انہوں نے اپنا مالی کاروبار اس طرح استوار کیا کہ وہ سود پر حکومتوں کو قرضے مہیا کرنے لگے۔ بینکوں کے کاروبار کی مالی اور فنی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر ہم قارئین کے سامنے جو حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں وہ صرف اتنی ہے کہ یہ قرضے اور بینکوں کا زیادہ تر کاروبار سود کی اساس پر چل رہا ہے، جس کی اسلام نے صاف اور واضح الفاظ میں ممانعت کی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی دوسری خصوصیت شدید کاروباری مسابقت ہے جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے کاروباری ادارے تباہ ہو جاتے ہیں یا پھر متحد ہو کر بڑے کاروباری ادارے قائم کر لیتے ہیں تاکہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کر سکیں۔ یہیں سے اجارہ

داری(monopoly)وجود میں آتی ہے‘ مگر اسلام اس اجارہ داری کا بھی مخالف ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلامﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ)) (مسلم‘ ابوداؤد‘ ترمذی)

’’اجارہ داری قائم کرنے والا گنہگار ہے۔‘‘

یہ ہیں سرمایہ داری کی دو بڑی بنیادیں۔ اسلام ان دونوں کا اصولاً مخالف ہے جس کے بعد اسلام کے خلافِ سرمایہ داری ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ تاہم اگر سرمایہ داری کا ظہور اسلام کے زیر سایہ ہوتا تو اس میں موجودہ خرابیاں رونما نہ ہوتیں اور نہ یہ نظام استحصال‘ نوآبادیاتی نظام اور جنگ وتباہی کا ہم معنی بن کر رہ جاتا۔

اگر صنعتی انقلاب اسلامی دنیا میں رونما ہوتا تو اسلام کو اسے اپنے رنگ میں رنگنے میں ہرگز کوئی الجھن پیش نہ آتی۔ اس کے زیر سایہ پیداوار بڑھ جاتی‘ مگر مالک اور مزدوروں کے تعلقات کی وہ نوعیت ہرگز نہ ہوتی جو انیسویں اور بیسویں صدی کے یورپ میں نظر آتی ہے۔ اس کے بجائے ان کا باہمی تعلق اس اصول پر استوار ہوتا جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں اور جو مالک اور مزدور کو منافع میں برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔

اس اسلامی طریقے پر عمل پیرا ہونے کے بعد سود اور اجارہ داری کا بالکل خاتمہ ہو جاتا اور مزدوروں کو اس بے انصافی‘ افلاس اور ذلت سے دوچار نہ ہونا پڑتا جن سے وہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں وقتاً فوقتاً دوچار ہوتے ہیں۔ یہ خیال کہ اس طرح کے معاشرتی انصاف کے قیام کے لیے اشتراکیت کی طرح اسلام کو بھی آزمائشوں‘ طبقاتی کشاکش اور اقتصادی دباؤ سے لازماً دوچار ہونا پڑتا‘ جس کے بعد اس کے قوانین میں خود بخود کچھ ترمیم و تنسیخ واقع ہو جاتی‘ ایک احمقانہ تصور ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کو غلامی‘ جاگیرداری اور ابتدائی سرمایہ داری کے مسائل سلجھانے میں دنیا کے تمام دوسرے نظاموں پر فوقیت حاصل ہے۔ اسلام نے آ کر جتنی اصلاحات بھی کیں‘ ان کا محرک کوئی خارجی دباؤ ہرگز نہیں تھا بلکہ ان کے پیچھے اسلام کے اپنے ابدی اصول کارفرما تھے‘ جن کا تمسخر اشتراکی مصنفین اپنی تحریروں میں اڑانے کے عادی ہیں۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ خود روس بھی جس کو مثالی اشتراکی مملکت قرار دیا جاتا ہے‘ جاگیرداری نظام سے نکلنے کے بعد اگلے مرحلے یعنی سرمایہ داری سے گزرے بغیر ہی اشتراکیت میں داخل ہو گیا۔ گویا روس نے جو کارل مارکس کے فلسفے کا پرچارک ہے‘ خود اپنی عملی مثال سے

مارکس کے اس نظریہ کی تردید کردی کہ ہر انسانی معاشرے کو اپنے ارتقاء کے دوران لازماً کچھ مخصوص ادوار میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

جہاں تک نوآبادیاتی نظام‘ جنگوں‘ دوسری قوموں کے استحصال اور سرمایہ داری کی لائی ہوئی دوسری عالمگیر برائیوں کا تعلق ہے‘ اسلام ان سب کے خلاف ہے۔ اپنی نوآبادیات قائم کرنے یا دوسروں کو اپنا آلہ کار بنانے کی غرض سے ان کے خلاف جنگ کرنے کو بھی اسلام پسند نہیں کرتا۔ اسلام صرف ایک جنگ کی اجازت دیتا ہے اور وہ ہے ظلم و جارحیت کے خلاف جنگ یا پُرامن ذرائع مسدود ہونے کی صورت میں اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر جہاد! تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جنگوں کے باب میں اسلام دنیا کا سب سے پاکیزہ نظام ہے۔ اسلامی جنگوں کے نتیجے میں کبھی کسی قوم کو استحصال کا نشانہ نہیں بنایا گیا اور نہ ہی کسی پر غلامی کی لعنت مسلط کی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر صنعتی انقلاب اسلامی دنیا میں رونما ہوا ہوتا تو فاضل پیداوار (surplus production) کے مسئلے کو پُرامن طور پر سلجھا لیا جاتا۔ دنیا کو نہ تو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کی ضرورت پیش آتی اور نہ کہیں نوآبادیاتی سامراج مسلط ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ فاضل پیداوار کا مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ بگڑی ہوئی صورت کی جڑ ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں کو بدل دیا جائے تو فاضل پیداوار کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو۔

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت ارتکازِ دولت کے معاملے میں بالکل بے بس ہوتی ہے‘ جبکہ اسلامی نظام میں حکومت غیر جانبدار تماشائی نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ دولت سمٹ کر صرف چند خاندانوں میں محدود نہ ہو جائے۔ ایسی صورت حال کا پیدا ہونا شریعت اسلامی کے منشا کے خلاف ہے‘ کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ دولت کی گردش چند لوگوں تک ہی محدود نہ ہو‘ بلکہ اتنی عام ہو کہ تمام انسان اس سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ اسلام میں حکمران کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی پر زیادتی اور ظلم کیے بغیر شریعت کو نافذ کرے۔ اس کے لیے اسے خدا کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اسلام کا قانونِ وراثت شریعت اسلامی کے اسی مزاج کو ظاہر کرتا ہے‘ جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک نسل اپنے پیچھے جو دولت اور جائیداد چھوڑے وہ بعد میں آنے والی نسل میں مناسب طور پر تقسیم ہو۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے‘ جس میں سالانہ آمدنی اور نفع کا اڑھائی فیصد حصہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔

مزید برآں اسلام صاف اور صریح الفاظ میں زراندوزی کی ممانعت کرتا ہے اور ساتھ ہی سود کو بھی حرام قرار دیتا ہے' جو کہ ارتکازِ زر کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسلام معاشرے کے مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو استحصال کے بجائے ذمہ داری کی اساس پر استوار کرتا ہے۔

ارشادِ نبویؐ کے مطابق اسلامی مملکت اپنے عمالؓ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''جو شخص ہماری (یعنی ریاست اسلامی کی) کوئی خدمت انجام دینے پر مامور ہے' اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اس کی شادی کرائی جائے گی۔ اگر اس کے پاس رہنے کو مکان نہ ہو تو مکان دیا جائے گا' خادم نہ ہو تو خادم دیا جائے گا' اور اگر سواری کے لیے اس کے پاس کوئی جانور نہ ہو تو اس کی سواری کے لیے جانور بھی مہیا کیا جائے گا۔'' ؎

بنیادی ضروریاتِ زندگی کی یہ ضمانت اسلامی ریاست کے عمال تک ہی محدود نہیں ہے' کیونکہ یہ تو ہر انسان کی ضرورتِ حیات ہیں۔ ہر وہ فرد ان کا مستحق ہے جو اسلامی ریاست یا معاشرے کی کوئی خدمت کسی حیثیت میں بھی انجام دیتا ہے۔ لہٰذا اگر اسلامی ریاست اپنے عمال کو یہ سہولتیں فراہم کرنے کا ذمہ لیتی ہے' تو معاشرے کے تمام دوسرے کارکنوں کو بھی اسے ویسی ہی سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست سرکاری خزانے سے ان تمام افراد کی کفالت کرتی ہے جو بڑھاپے' بیماری یا کم سنی کی وجہ سے اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان لوگوں کو بھی سرکاری خزانے سے مالی اعانت دی جاتی ہے' جن کے ذرائع آمدن محدود اور ناکافی ہوتے ہیں۔ یہ تمام حقائق ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست اپنی حدود میں رہنے والے تمام افراد کو بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جو طریقۂ کار اختیار کرتی ہے وہ چنداں اہم نہیں۔ اصل اہمیت اسلامی ریاست کے اس بنیادی اصول کی ہے' جو قومی نفع اور نقصان میں قوم کے تمام افراد کو برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔ اس سے کارکن اور مزدور نہ صرف دوسروں کے استحصال سے محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ صاف ستھری زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔

اسلام کے زیر سایہ سرمایہ داری کی وہ مکروہ صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی جو آج کے ''مہذب'' مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں نظر آتی ہے۔ شریعت اسلامی کا کوئی قانون' خواہ وہ شارع علیہ السلام سے ماخوذ ہو یا بعد میں حالات کے اقتضاء سے حدودِ شریعت میں رہ کر اجتہاد کر

کے بنایا گیا ہو' سرمایہ داروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ محنت کاروں کو اپنی ہوسِ زرگری کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اسلام میں سرمایہ داری کی دوسری لعنتیں مثلاً نوآبادیاتی سامراج' جنگیں اور غلامی وغیرہ بھی کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔ معیشت کے سلسلے میں اسلام صرف اچھے اچھے قانون اور ضابطے بنا دینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ ان کے ساتھ وہ انسان کے ان اخلاقی اور روحانی جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے' جنہیں کمیونسٹ (Communist) صرف اس لیے تمسخر کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کہ یورپ کی تاریخ ان کی عملی افادیت کی تمام علامتوں سے خالی ہے۔ بہرحال اسلام کے نزدیک اخلاقی اور روحانی اقدار انسان کی عملی زندگی سے الگ نہیں ہوتیں۔ اسلام اس لحاظ سے ایک منفرد نظامِ حیات ہے کہ وہ روح کی پاکیزگی اور معاشرے کی تنظیم کو باہم ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ وہ نہ معاشرے کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ فرد کو خلا میں چھوڑتا ہے کہ نظریے اور عمل میں مطابقت پیدا کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قانون اور اخلاق میں کبھی تضاد پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں' پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اور ایک پہلو میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ دوسرے سے پوری ہو جاتی ہے۔ ان میں کبھی کوئی کشمکش یا تناقض کی صورت رونما نہیں ہوتی۔

اسلام انسان کو جس روحانی سربلندی سے ہمکنار کرتا ہے وہ ایسے اقتصادی قوانین کے نفاذ کو آسان بنا دیتی ہے جن سے سرمایہ داری کی جملہ خرابیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب ان قوانین کا عملی نفاذ کیا جاتا ہے تو معاشرے کے افراد ان پر برضا و رغبت عمل کرتے ہیں۔ ان کے اس عمل کا محرک سزا کا کوئی خوف نہیں ہوتا بلکہ ان کا اپنا اخلاقی احساس ہوتا ہے' کیونکہ جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے وہی قانون کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔

آخر میں ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سرمایہ داری کی وہ مکروہ صورت جو اس وقت اسلامی دنیا پر مسلط ہے' اس کا اسلامی نظام سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے' اس لیے اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کے لیے کسی طرح بھی اسلام کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

بقیہ: عرضِ احوال

۱۹۵۹ء میں ''میثاق'' کا جب اجراء ہوا تو پاکستان کے خلاف امریکی سازش' جو دراصل یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھی' کا پہلا کاری وار ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کی صورت میں لگ چکا تھا۔ گویا پاکستان کو ناکام ریاست ثابت کرنے اور اسے انتہائی کمزور بلکہ معدوم کرنے کی اُس یہودی سازش کا آغاز ہو چکا تھا جو اب اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے ——— یاد رہے کہ ریاست اسرائیل کے قیام کے ساتھ ہی ازل سے جاری حق و باطل کی جنگ اور خیر و شر کا معرکہ اپنے اس آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جسے احادیث مبارکہ میں فتنۂ دجال سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں دنیا کی ساری ابلیسی اور دجالی قوتیں (جو "**مغضوب علیھم**" اور "**ضالّین**" یعنی یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ پر مشتمل ہیں) اسلام کو مٹانے کے لیے مل جل کر زور لگائیں گی اور اپنے غیر معمولی اسباب و وسائل کے بل پر (یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو برتری انہیں حاصل ہوگی اسے پورے طور پر بروئے کار لاتے ہوئے خوفناک ترین جنگی ساز و سامان اور انتہائی مہلک اور تباہ کن اسلحہ کے زور پر) مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو ایمان و اسلام اور دینی اقدار سے منحرف کر کے چھوڑیں گی۔ اللہ کے وفاداروں پر قافیہ حیات تنگ کر کے یہ ابلیسی و دجالی قوتیں گویا خلافتِ ارضی کے لیے تخلیقِ آدم کے خدائی فیصلے کو ناکام ثابت کرنے کے ابلیسی ایجنڈے کو کامیاب کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے سادہ انداز میں واضح فرمایا۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش   تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ   ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اگرچہ ۱۹۴۸ء میں ریاست اسرائیل کے قیام کے معاً بعد ہی حق و باطل کے فیصلہ کن معرکے کا بالقوۃ آغاز ہو گیا تھا' تاہم اس میں تیزی اور شدت ۲۰۰۱ء میں نائن الیون کے ''ڈرامے'' کے بعد آئی ——— قبل ازیں ۱۹۹۱ء کی خلیج کی جنگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ لیکن نائن الیون کے بعد گویا دنیا کی تمام بڑی طاقتوں نے عالم اسلام کے خلاف طبلِ جنگ بجا دیا۔ امریکہ کی جانب سے نیو ورلڈ آرڈر کا اعلان اور پھر جارج ڈبلیو بش کا نائن الیون کے حادثے کے بعد جوابی کارروائی کو Crusades (یعنی صلیبی جنگ) قرار دینا اس امر کی چغلی کھاتا ہے کہ یہ اسی عالمی جنگ کی تیاری ہے جو حق و باطل کے آخری اور فیصلہ کن معرکے کا درجہ رکھتی ہے۔

حق و باطل کے اس معرکے میں بدقسمتی سے اسلام کے نام پر بننے والے ملک پاکستان کا کردار نہایت مایوس کن بلکہ شرمناک نظر آتا ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے ایٹمی صلاحیت سے بھی نواز رکھا ہے۔ نائن الیون کے بعد اس ایٹمی قوت کا امریکہ کی ایک دھمکی پر بچھ جانا اور اس کے تمام ناجائز مطالبات کو مِن وعن تسلیم کر لینا ہمارا وہ قومی جرمِ عظیم ہے جس کی سزا آج کل ہم مختلف قسم کے عذابوں کی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ افغان پالیسی کے معاملے میں ہمارا یوٹرن کوئی سادہ اور بے ضرر معاملہ نہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امریکہ کی عالمی جنگ میں' جسے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خاطر War on Terror کا عنوان دیا گیا تھا' امریکہ کا دست و بازو (Front Line Ally) بننا اور افغانستان کی اسلامی حکومت کے بخیے ادھیڑنے اور ہزارہا بے گناہ افغان عوام کو خون میں نہلا کر انتقام کی آگ کو بجھانے کے گھناؤنے جرم میں امریکہ کی بھرپور معاونت کرنا دراصل ہماری طرف سے اس بات کا دوٹوک اعلان تھا کہ حق و باطل کے اس اہم ترین معرکے میں ہم باطل یعنی ابلیسی قوتوں کے کھلے طرفدار ہیں اور حق کی قوتوں کے خلاف ہمارا کھلا اعلانِ جنگ ہے —— سچی بات یہ ہے کہ نائن الیون کے ایک یوٹرن نے ہمیں اللہ اور اُس کے دین کے بدترین غداروں اور دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ زبان سے ہم لاکھ کلمہ طیبہ کا ورد کریں' اپنے عمل سے ہم نے ثابت کر دکھایا ہے کہ ہم اللہ اور اُس کے دین کے باغی اور دشمن ہیں —— اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم اپنے اس جرمِ عظیم کے ادراک اور شعور سے بھی عاری ہیں ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

ہم نے مسلسل باسٹھ برس اس ملک میں شریعت کے نفاذ اور دینِ حق کے قیام سے گریز کی روش اختیار کر کے دین سے اپنا عدمِ اخلاص اور اللہ سے بے وفائی کا ثبوت فراہم کیا اور نائن الیون کے بعد باطل قوتوں کا ساتھ دے کر دین سے بغاوت کی اس روش پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے —— یوں آج ہم اللہ کی تائید و نصرت اور فضل و رحمت سے محروم ہو کر بدترین عذابِ الٰہی کے مستحق بن چکے ہیں ؎

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

آج اگر ہمیں ہر طرف سے عذاب کے سائے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں تو واویلا کس بات کا ہے؟ کیا بھوک اور خوف کا عذاب اللہ کی نعمتوں کی ناقدری اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ نہیں ہوتا؟ کیا کسی قوم کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر باہم دگر قتل و غارت گری کرنا عذابِ الٰہی کی ایک شکل نہیں

ہے؟ کیا افغانستان میں امریکہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جس سے بچاؤ کی خاطر ہم نے اپنا ایمان بیچ ڈالا تھا‘ آج ہمارے ملک کی سرحدوں کے اندر داخل نہیں ہوگئی؟ کیا بلوچستان کی علیحدگی کی سازش ایک مجسم حقیقت بن کر سامنے نہیں آ گئی؟ کیا امریکی دباؤ پر آج ہم ہر وہ کام نہیں کر رہے جو ملک و قوم کے لیے اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے؟ کیا پاکستان کی بنیادیں کھودنے کی خاطر ہمارے دشمن نے کدال خود ہمارے ہی ہاتھوں میں نہیں تھما دی؟ اور کیا پاکستان کے خاتمے اور اس کے حصے بخرے ہو جانے کی پیشین گوئیاں کرنے والے اسلام دشمن عالمی دانشور آج خوشی کے شادیانے بجاتے نظر نہیں آتے؟ سچی بات یہ ہے کہ ہم بدترین تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں۔ بچاؤ کا راستہ صرف ایک ہے—— امریکی غلامی سے نکل کر اللہ کی سچی غلامی اختیار کرنا۔ رب کی رحمت و نصرت کے بغیر بدترین انجام سے بچنا ممکن نہیں۔ اجتماعی سچی توبہ اور رب کی وفاداری کے عملی تقاضوں کو پورا کر کے آج بھی ہم ربِّ ذوالجلال کی حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔ ربِّ کائنات کی حمایت و نصرت اگر حاصل ہو جائے تو کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ؎

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے!

بصورت دیگر ”تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن—— پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

—— بظاہر احوال ہمارا ملک اسی انجام کی طرف بڑھتا نظر آ رہا ہے کہ جس کی پیشگی وارننگ بانی تنظیم اسلامی نے اپنے چار سال قبل کے خطاب کہ ”کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟“ میں دی تھی۔ تاہم‘ ہمیں تو اپنے قول و عمل سے اللہ کی رحمت و نصرت کی دہائی دیتے رہنا ہے۔ کیا عجب اللہ کی رحمت جوش مارے اور اس کی خصوصی مداخلت ہماری تباہی کے اس سفر کا راستہ روک دے—— بہرکیف اگر اہل پاکستان کی قسمت میں اللہ کی طرف سے مستقبل قریب میں کوئی سخت فیصلہ طے شدہ ہے تب بھی ہمیں یقین ہے کہ دین کے غلبہ و قیام کے لیے مخلص لوگوں کی محنتیں اور قربانیاں رائیگاں نہ جائیں گی اور بعد از خرابیٔ بسیار اس خطے میں دینِ حق کا قیام بالآخر ہو کر رہے گا‘ جس کا نقطہ آغاز‘ ان شاء اللہ العزیز‘ افغانستان کی سرزمین ثابت ہوگی جہاں حق و باطل کا یہ معرکہ براہ راست جنگ کی صورت میں جاری و ساری ہے اور ان شاء اللہ بہت جلد اپنے منطقی انجام تک پہنچنے والا ہے۔ **وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!**

۲۰۰۹/۱۱/۱۲ء